رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
مئی ۲۰۱۳ء

ماہنامہ

میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کیا انتخابات پاکستان کو
بحرانوں سے نکال سکتے ہیں؟

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد :	62
شمارہ :	5
رجب المرجب	1434ھ
مئی	2013ء
فی شمارہ	-/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک — 250 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش — 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ — 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ — 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

لوحِ جبیں تازہ کریں!

وطنِ عزیز پاکستان دنیا کی واحد مملکت ہے جو ایک نظریے کی بنیاد پر قائم ہوئی' لیکن بعض سیکولر دانشور اس حقیقت کو گاہے بگاہے دھندلانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ کبھی قائداعظم کی ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کے ایک جملے کو بنیاد بنا کر پاکستان کی بنیادیں کمزور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی نصابِ تعلیم سے ان مضامین کو کھرچنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اس نظریہ کے حق میں تحریر کیے گئے ہوں۔ اس بار ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے نظریۂ پاکستان کی تعریف طے کیے جانے کا نکتہ اُٹھا کر اس بحث کا دوبارہ آغاز کر دیا ہے۔ اس بار اس کام کے لیے جس طرح میڈیا پر مہم شروع کی گئی ہے اور نگران حکومت میں جس طرح کچھ سیکولر عناصر کو ذمہ داریاں دی گئی ہیں جو نظریۂ پاکستان کے لفظ ہی سے بیر رکھتے ہیں' اس سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نظریۂ پاکستان کے حوالے سے مروڑ کس کے پیٹ میں اُٹھتا ہے اور اس کے لیے ڈوری کہاں سے ہلائی جاتی ہے۔ بہرحال بیرونی آقاؤں کے حکم پر جس طرح یہ حضرات اپنا موقف دہرانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اسی طرح محبِّ وطن پاکستانیوں کا بھی فرض ہے کہ وہ جواباً تاریخ کا ریکارڈ درست کرتے رہیں۔ بقول شاعر ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

اس بار یار لوگوں نے نظریۂ پاکستان کے خلاف جس دیدہ دلیری اور اعتماد کے ساتھ منظم مہم شروع کی ہے وہ خطرے کا الارم ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ افواجِ پاکستان کے سالار جنرل کیانی کو اپنے حالیہ بیان میں کہنا پڑا کہ اسلام اور پاکستان کو الگ نہیں کیا جا سکتا اور پاکستان کے استحکام کی ضمانت صرف اسلام ہے۔ لہٰذا ان حالات میں آج پھر یہ سبق تازہ کرنے کی ضرورت ہے کہ نظریۂ پاکستان ہے کیا؟ اس سوال کا جواب اگر ان محرکات کی روشنی میں تلاش کریں جو عام طور پر قیامِ پاکستان کا سبب سمجھے جاتے ہیں تو قارئین کو بات سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ دراصل قیامِ پاکستان کے مقاصد و محرکات کو عام طور پر تین نقطہ ہائے نظر کے تحت بیان کیا جاتا ہے:

۱) پاکستان مسلمانوں کو ہندوؤں کے معاشی استحصال سے نجات دلانے کے لیے بنایا گیا۔

۲) پاکستان کا قیام ہندوؤں کے منفی طرزِ عمل اور ان کی منافرت کے خلاف مسلمانوں کا احتجاج تھا۔

۳) پاکستان مسلمانوں کے انفرادی تشخص یعنی ان کے دین کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے بنایا گیا' یا دوسرے لفظوں میں اس کا محرک اسلام اور صرف اسلام ہے اور پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانا مقصود تھا۔

مسلمانوں نے جب سے ہندوؤں سے علیحدگی کی جدّوجہد شروع کی ہے اس میں صرف معاشی مسئلے کو کبھی بنیاد نہیں بنایا گیا' اگرچہ معاشی مسئلہ اس پوری جدّوجہد کا ایک پہلو ضرور تھا۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ معاشی بنیادوں پر ان کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے' وہ صرف اس لیے ہے کہ وہ مذہباً مسلمان ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کا اصل منصوبہ ''رام راج'' تھا۔ ''رام راج'' کی تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ طویل قیام' مستقل سکونت اور حکومت سے ہندوستان میں ان کا جو ایک تشخص' وقار اور احترام قائم ہو گیا تھا' اسے مٹا کر یہ صورت پیدا کی جائے کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اصل حاکمیت اور اقتدار ہندو کے ہاتھ میں ہو' کیونکہ وہ تین چوتھائی اکثریت میں ہیں اور مسلمان ان کی محکومیت پر برضا و رغبت قانع ہو جائیں تو ان کے حق میں بہتر ہے' ورنہ انہیں یا تو دوبارہ ہندومت میں شامل کر کے (شدھی) یا ملک بدر کر کے (سنگھٹن) فنا کر دیا جائے گا۔ بہرحال مسلمانوں کی جدوجہد میں کہیں طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے نہ امیر غریب کا مسئلہ سامنے آیا' بلکہ انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی کی یہ جنگ امیروں اور غریبوں نے مل کر لڑی تھی۔ بقول سید حسن ریاض (مصنف: پاکستان ناگزیر تھا) ''ہندوستان کے پورے انگریزی دور میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی جھگڑا مسلمانوں سے سود در سود وصول کرنے پر' یا مسلمانوں کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے کی وجہ سے' یا سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو واجبی حصہ نہ دینے کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا ہو۔ ہندو واقعی مسلمانوں کا معاشی استحصال کرتے تھے اور بالجبر کرتے تھے اس جبر کی نوعیت اور اقسام بہت سی تھیں اور مسلمانوں کو یہ ناگوار بھی تھا۔ تاہم یہ کہنا کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو اس معاشی استحصال کی وجہ سے تقسیم کرایا اور انہوں نے پاکستان کی تحریک اس معاشی استحصال کو روکنے کے لیے جاری کی' بالکل غلط ہے۔''

رہی یہ بات کہ پاکستان کا قیام ہندوؤں کے منفی طرزِ عمل کا نتیجہ تھا' یہ نقطۂ نظر کوئی مستقل سبب نہیں' البتہ جزوی سبب ضرور ہے۔ کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا' کیونکہ ہندوؤں کا طرزِ عمل واقعی مسلم منافرت پر مبنی تھا۔ ان کے چند مشہور اکابر کے مندرجہ ذیل بیانات سے ان کے جرائم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(باقی صفحہ 91 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ یُوسُف

آیات ۳۶ تا ۴۲

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ۝ وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ ۝

آیت ۳۶ ﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ﴾ ’’اور داخل ہوئے آپؑ کے ساتھ جیل میں دو نوجوان۔‘‘

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل بھیجا گیا تو اتفاقاً اسی موقع پر دو اور قیدی بھی آپؑ کے ساتھ جیل میں داخل کیے گئے۔

﴿قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ﴾ ’’ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں۔‘‘

﴿وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ﴾ ’’اور دوسرے نے کہا کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔‘‘

﴿نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝﴾ ’’ہمیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دیجیے‘ ہم آپؑ کو بہت نیکوکار دیکھتے ہیں۔‘‘

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپؑ دوسرے قیدیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ آپؑ اعلیٰ اخلاق اور قابلِ رشک کردار کے مالک ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپؑ ہمارے خوابوں کے سلسلے میں ضرور ہماری راہنمائی فرمائیں گے۔

آیت ۳۷ ﴿قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ؕ﴾ ’’یوسفؑ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو جو کھانا دیا جاتا ہے اس کے آنے سے پہلے پہلے میں تم دونوں کو اس کی تعبیر بتا دوں گا۔‘‘

جیل میں قیدیوں کے کھانے کے اوقات مقرر ہوں گے۔ آپؑ نے فرمایا کہ آپ لوگ اب تعبیر کے بارے میں فکرمت کرو‘ وہ تو میں کھانا آنے سے پہلے پہلے آپ لوگوں کو بتا دوں گا‘ لیکن میں تم لوگوں سے اس کے علاوہ بھی بات کرنا چاہتا ہوں‘ لہٰذا اِس وقت تم لوگ میری بات سنو۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ طریقہ ایک داعیٔ حق کے لیے راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ ایک داعی کی ہر وقت یہ کوشش ہونی چاہیے کہ تبلیغ کے لیے‘ حق بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے جب اور جہاں موقع میسر آئے اس سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ لوگ میری طرف خود متوجہ ہوئے ہیں تو آپؑ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ان کی حاجت کو مؤخر

کر کے پہلے انہیں پیغامِ حق پہنچانا ضروری سمجھا۔

﴿ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ﴾ ''یہ اُس علم میں سے ہے جو میرے ربّ نے مجھے سکھایا ہے۔''

آپؑ نے انہی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی بات شروع کی اور خوابوں کی تعبیر کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا تعارف کرایا' کہ یہ علم مجھے میرے رب نے سکھایا ہے' اس میں میرا اپنا کوئی کمال نہیں ہے۔

﴿اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۳۷﴾

''(دیکھو!) میں نے ترک کر دیا ہے اُس قوم کا راستہ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں۔''

آیت ۳۸ ﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ﴾ ''اور میں نے پیروی کی ہے اپنے آباء ابراہیم' اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کے طریقے کی۔''

آپؑ کی اس بات سے موروثی اور شعوری عقائد کا فرق سمجھ میں آتا ہے۔ یعنی ایک تو وہ عقائد ونظریات ہیں جو بچہ اپنے والدین سے اپناتا ہے' جیسے ایک مسلمان گھرانے میں بچے کو موروثی طور پر اسلام کے عقائد ملتے ہیں۔ اللہ اور رسولؐ کا نام وہ بچپن ہی سے جانتا ہے' ابتدائی کلمے اس کو پڑھا دیے جاتے ہیں' نماز بھی سکھا دی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد اپنے آزادانہ انتخاب کے نتیجے میں اپنے علم اور غور وفکر سے کوئی عقیدہ اختیار کرے گا تو وہ اس کا شعوری عقیدہ ہو گا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اس شعوری عقیدے کا ذکر کیا کہ اگرچہ وہ جن لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں' وہ اللہ' اس کے کسی نبی اور وحی وغیرہ کے تصورات سے نابلد ہیں' سب کے سب کافر اور مشرک ہیں' مگر مجھے دیکھو میں نے اس ماحول کا اثر قبول نہیں کیا' اپنے اردگرد کے لوگوں کے نظریات وعقائد نہیں اپنائے' بلکہ پورے شعور کے ساتھ اپنے آباء واَجداد کے نظریات کو صحیح مانتے ہوئے ان کی پیروی کر رہا ہوں' صرف اس لیے نہیں کہ وہ میرے آباء واَجداد تھے' بلکہ اس لیے کہ یہی راستہ میرے نزدیک معقول اور عقلِ سلیم کے قریب تر ہے۔

﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ﴾ ''(دیکھو!) ہمارے لیے یہ روا

نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی بھی شے کو شریک کریں۔''

﴿ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۳۸﴾

''یہ اللہ کا بڑا فضل ہے ہم پر اور سب لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

یعنی شرک سے بچنے اور توحید کو اپنانے کا عقیدہ دراصل اللہ کا اپنے بندوں پر بہت بڑا فضل ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس حیثیت میں انسان کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کی پرستش کرتا پھرے جنہیں خود اس کی خدمت اور استفادے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

آیت ۳۹ ﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۳۹﴾

''اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا بہت سے متفرق ربّ بہتر ہیں یا اکیلا اللہ سب پر حاوی وغالب؟''

آیت ۴۰ ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ﴾ ''نہیں پوجتے تم اُس (اللہ) کے سوا مگر چند ناموں کو جو موسوم کر رکھے ہیں تم لوگوں نے اور تمہارے آباء واَجداد نے''

﴿مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ﴾ ''نہیں اتاری اللہ نے ان کے لیے کوئی سند۔ اختیارِ مطلق تو صرف اللہ ہی کا ہے۔''

قانون بنانے اور اس کے مطابق حکم چلانے کا اختیار صرف اللہ کا ہے۔

﴿اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ﴾ ''اُس نے حکم دیا ہے کہ تم اُس کے سوا کسی کی بندگی مت کرو!''

﴿ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۴۰﴾ ''یہی ہے دین سیدھا (اور ہمیشہ سے قائم ودائم) لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''

آیت ۴۱ ﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ﴾ ''اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔''

یہاں پر رب کا لفظ بادشاہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ اس شخص کے خواب کی تعبیر ہے

جس نے خود کو شراب کشید کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ شخص پہلے بھی بادشاہ کا ساقی تھا مگر اس پر کوئی الزام لگا اور اسے جیل بھیج دیا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خبر دے دی کہ اس کے خواب کے مطابق وہ اس الزام سے بری ہو کر اپنے پرانے عہدے پر بحال ہو جائے گا۔

﴿وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ﴾ ’’اور جو دوسرا ہے اُسے سُولی دے دی جائے گی اور پرندے اُس کے سر میں سے (نوچ نوچ کر) کھائیں گے۔‘‘

﴿قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱﴾ ’’فیصلہ کر دیا گیا ہے اُس معاملے کا جس کے بارے میں تم دونوں مجھ سے پوچھ رہے تھے۔‘‘

آیت ۴۲ ﴿وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ﴾ ’’اور یوسفؑ نے کہا اُس شخص سے جس کے بارے میں آپؑ نے گمان کیا کہ وہ ان دونوں میں سے نجات پائے گا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر بھی کرنا۔‘‘

یعنی تمہیں کبھی موقع ملے تو بادشاہ کو بتانا کہ جیل میں ایک ایسا قیدی بھی ہے جس کا کوئی قصور نہیں اور اسے خواہ مخواہ جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔

﴿فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ۝۴۲﴾ ’’تو اُسے بھلائے رکھا شیطان نے ذکر کرنا اپنے آقا سے، تو آپؑ رہے جیل میں کئی برس تک۔‘‘

بِضْع کا لفظ عربی زبان میں دو سے لے کر نو تک (دس سے کم) کی تعداد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

آیات ۴۳ تا ۴۹

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ۝۴۴ وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝۴۵ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ

لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۴۶ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝۴۷ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝۴۸ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝۴۹

آیت ۴۳ ﴿وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ﴾ ’’اور بادشاہ نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں، جن کو کھا رہی ہیں سات دُبلی گائیں‘‘

اب یہاں سے اس قصے کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے۔ اُس وقت مصر پر فراعنہ کی حکومت نہیں تھی، بلکہ وہاں چرواہے بادشاہ (Hyksos Kings) حکمران تھے۔ تاریخ میں اکثر ایسے واقعات ملتے ہیں کہ کچھ صحرائی قبیلوں نے قوت حاصل کر کے متمدّن علاقوں پر چڑھائی کی، پھر یا تو وہ لوٹ مار کر کے واپس چلے گئے یا اُن علاقوں پر اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ ایسی ہی ایک مثال مصر کے چرواہے بادشاہوں کی ہے جو صحرائی قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے کسی زمانے میں مصر پر حملہ کیا اور مقامی لوگوں (قبطی قوم) کو غلام بنا کر وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہاں جس بادشاہ کا ذکر ہے وہ اسی خاندان سے تھا۔ اس بادشاہ کے کردار اور رویے کی جو جھلک اس قصے میں دکھائی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ توحید و رسالت سے نابلد تھا مگر ایک نیک سرشت انسان تھا۔

﴿وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ﴾ ’’اور سات بالیاں ہیں ہری اور دوسری (سات) خشک۔‘‘

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳﴾ ’’تو اے میرے درباریو! مجھے بتاؤ تعبیر میرے خواب کی اگر تم لوگ خوابوں کی تعبیر کر سکتے ہو۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ۝۴۴﴾ ’’انہوں نے کہا کہ یہ تو پریشان خیالات ہیں، اور ایسے خوابوں کی تعبیر ہم نہیں جانتے۔‘‘

بادشاہ کے خواب کو سن کر انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی معنوی خواب نہیں، ایسے ہی

بے معنی اور منتشر قسم کے خیالات ہیں جن کی ہم کوئی تعبیر نہیں کر سکتے۔ فرائڈ کا بھی یہی خیال ہے کہ خواب میں انسان اپنے شہوانی خیالات اور دوسری دبی ہوئی نفسانی خواہشات کی تسکین کرنا چاہتا ہے‘ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم ''رؤیائے صادقہ'' کی ہے یعنی سچے خواب‘ یہ اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور ایسے خوابوں کے بارے میں حضورﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ نبوت کے اجزاء میں سے ہیں۔ دوسری قسم کے خواب وہ ہیں جو شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور ان میں بعض اوقات شیاطینِ جن اپنی طرف سے خیالات انسانوں کے ذہنوں میں الہام بھی کرتے ہیں۔ تیسری قسم کے خواب وہ ہیں جن کا ذکر فرائڈ نے کیا ہے۔ یعنی انسان کے اپنے ہی خیالات منتشر انداز میں مختلف وجوہات کی بنا پر سوتے وقت انسان کے ذہن میں آتے ہیں اور ان میں کوئی معنی یا ربط ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

آیت ۴۵ ﴿وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْھُمَا وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ﴾ ''اور کہا اُس شخص نے جو اُن دونوں (قیدیوں) میں سے نجات پا گیا تھا اور ایک طویل عرصے کے بعد اسے (اچانک) یاد آ گیا''

وہ شخص جیل سے رہا ہو کر پھر سے ساقی گری کر رہا تھا۔ اسے بادشاہ کے خواب کے ذکر سے اچانک حضرت یوسفؑ یاد آ گئے کہ ہاں جیل میں ایک شخص ہے جو خوابوں کی تعبیر بتانے میں بڑا ماہر ہے۔

﴿اَنَا اُنَبِّئُکُمْ بِتَاْوِیْلِہٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾﴾ ''(اس نے کہا) میں بتا دوں گا تم لوگوں کو اس کی تعبیر‘ بس مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف کے پاس) بھیج دیں۔''

اس طرح وہ شخص جیل میں حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچ کر آپؑ سے مخاطب ہوا:

آیت ۴۶ ﴿یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْکُلُھُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ﴾ ''اے یوسف! اے راست باز! ہمیں تعبیر بتایئے سات موٹی گائیوں کے بارے میں کہ انہیں کھا رہی ہیں سات دبلی‘ اور سات سبز بالیوں اور دوسری (سات) خشک بالیوں کے بارے میں''

﴿لَّعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''تاکہ میں واپس جاؤں (تعبیر لے کر) اُن لوگوں کے پاس‘ تاکہ انہیں بھی معلوم ہو جائے۔''

آیت ۴۷ ﴿قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ﴾ ''یوسفؑ نے (تعبیر بتاتے ہوئے) فرمایا کہ تم سات سال تک خوب زراعت کرو گے لگاتار۔''

﴿فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْہُ فِیْ سُنْۢبُلِہٖٓ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْکُلُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''تو (اس دوران میں) جو فصل بھی تم کاٹو اُسے رہنے دینا اس کی بالیوں ہی میں‘ سوائے اُس قلیل تعداد کے جو تم کھاؤ۔''

آپؑ نے صرف اس خواب کی تعبیر ہی نہیں بتائی بلکہ مسئلے کی تدبیر بھی بتا دی اور تدبیر بھی ایسی جو شاہی مشیروں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ آج کے سائنسی تجربات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اناج کو محفوظ کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے سٹوں کے اندر ہی رہنے دیا جائے اور ان سٹوں کو محفوظ کر لیا جائے۔ اس طرح سے اناج خراب نہیں ہوتا اور اسے کیڑوں مکوڑوں سے بچانے کے لیے کسی اضافی preservative کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

آیت ۴۸ ﴿ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ سَبْعٌ شِدَادٌ﴾ ''پھر اس کے بعد سات سال آئیں گے بہت سخت''

خوشحالی کے سات سالوں کے بعد سات سال تک خشک سالی کا سماں ہو گا جس کی وجہ سے ملک میں شدید قحط پڑ جائے گا۔

﴿یَّاْکُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَھُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''وہ (سات سال) چٹ کر جائیں گے اس کو جو کچھ تم نے ان کے لیے بچا رکھا ہو گا سوائے اُس کے جو تم (بیج کے لیے) محفوظ کر لو گے۔''

حضرت یوسفؑ نے خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ سات سال تک ملک میں بہت خوشحالی ہو گی‘ فصلیں بہت اچھی ہوں گی‘ مگر ان سات سالوں کے بعد سات سال ایسے آئیں گے جن میں خشک سالی کے سبب شدید قحط پڑ جائے گا۔ اس مسئلے کی تدبیر آپؑ نے یہ بتائی کہ پہلے سات سال کے دوران صرف ضرورت کا اناج استعمال کرنا‘ اور باقی سِٹّوں کے اندر ہی محفوظ کرتے جانا اور جب قحط کا زمانہ آئے تو ان سِٹّوں سے نکال کر بقدرِ ضرورت اناج استعمال کرنا۔

آیت ۴۹ ﴿ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ عَامٌ فِیْہِ یُغَاثُ النَّاسُ وَفِیْہِ یَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''پھر آئے گا اس کے بعد ایک سال کہ اس میں خوب بارشیں ہوں گی لوگوں پر اور اس

میں وہ (انگور کا) رس نچوڑیں گے۔''

جب خوب بارشیں ہوں گی تو انگور کی بیلیں خوب پھلیں پھولیں گی' انگور کی پیداوار بھی خوب ہوگی' لوگ خوب انگور نچوڑیں گے اور شراب کشید کریں گے۔

آیات ۵۰ تا ۵۷

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

آیت ۵۰ ﴿وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ﴾ ''(یہ سن کر) بادشاہ نے کہا کہ اُس شخص کو میرے پاس لے آؤ!''

بادشاہ اپنے خواب کی تعبیر اور پھر اس کی ایسی اعلیٰ تدبیر سن کر یقیناً بہت متاثر ہوا ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا کہ ایسے ذہین' فطین شخص کو جیل میں نہیں بلکہ بادشاہ کا مشیر ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اس قیدی کو فوراً میرے پاس لے کر آؤ۔

﴿فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ﴾ ''پھر جب آیا آپؑ کے پاس

ایلچی' تو آپؑ نے فرمایا کہ تم واپس چلے جاؤ اپنے آقا کے پاس''

بادشاہ کا پیغام لے کر جب قاصد آپؑ کے پاس پہنچا تو آپؑ نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ میں اس طرح ابھی جیل سے باہر نہیں آنا چاہتا۔ پہلے پورے معاملے کی چھان بین کی جائے کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں جیل بھیجا گیا تھا۔ اگر مجھ پر کوئی الزام ہے تو اس کی مکمل تفتیش ہو اور اگر میرا کوئی قصور نہیں ہے تو مجھے علی الاعلان بے گناہ اور بری قرار دیا جائے۔ چنانچہ آپؑ نے اس قاصد سے فرمایا کہ تم اپنے بادشاہ کے پاس واپس جاؤ:

﴿فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ﴾ ''اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟''

﴿اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝۵۱﴾ ''یقیناً میرا رب ان کی چالوں سے خوب واقف ہے۔''

بادشاہ تک یہ بات پہنچی تو اس نے سب بیگمات کو طلب کر لیا۔

آیت ۵۱ ﴿قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ﴾ ''اُس نے پوچھا کہ کیا معاملہ تھا تمہارا جب تم سب نے پھسلانا چاہا تھا یوسف کو؟''

﴿قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ﴾ ''انہوں نے کہا کہ اللہ گواہ ہے' ہمارے علم میں اس کے بارے میں کوئی بھی برائی نہیں ہے۔''

اُس وقت جو کچھ بھی ہوا تھا وہ سب ہماری طرف سے تھا' یوسفؑ کی طرف سے کوئی غلط بات ہم نے محسوس نہیں کی۔

﴿قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱﴾ ''(اس پر) عزیز کی بیوی بھی بول اٹھی کہ اب حقیقت تو واضح ہو ہی گئی ہے' میں نے ہی اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی اور وہ بالکل سچا ہے۔''

اس طرح عزیز کی بیوی کو اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا پڑا کہ یوسفؑ نے نہ تو زبان سے کوئی غلط بیانی کی ہے اور نہ ہی اس کے کردار میں کوئی کھوٹ ہے۔

آیت ۵۲ ﴿ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ﴾ ''یہ اس لیے کہ وہ جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی''

یہ فقرہ سیاقِ عبارت میں کس کی زبان سے ادا ہوا ہے اس کے بارے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ اس لیے کہ اس فقرے کے موقع محل اور الفاظ میں متعدد امکانات کی گنجائش ہے۔ ان اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ یہ فقرہ عزیز کی بیوی کی زبان ہی سے ادا ہوا ہے کہ میں نے ساری بات اس لیے سچ سچ بیان کر دی ہے تاکہ یوسفؑ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس سے کوئی غلط بات منسوب کر کے اس کی خیانت نہیں کی۔

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۵۲﴾ ''اور یہ کہ یقیناً اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا۔''

آیت ۵۳ ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ ''اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتی' یقیناً (انسان کا) نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے''

﴿اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵۳﴾ ''سوائے اُس کے جس پر میرا ربّ رحم فرمائے۔ یقیناً میرا ربّ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

اگر گزشتہ آیت میں نقل ہونے والے بیان کو عزیز مصر کی بیوی کا بیان مانا جائے تو اس صورت میں آیت زیر نظر بھی اسی کے کلام کا تسلسل قرار پائے گی اور اس کا ترجمہ وہی ہو گا جو اوپر کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ دراصل اس نظریے کے مطابق ہے جس کے تحت ہمارے بہت سے مفسّرین اور قصّہ گو حضرات نے مائی زُلیخا کو ولی اللہ کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ اور کچھ بعید بھی نہیں کہ اس کا عشقِ مجازی وقت کے ساتھ ساتھ عشقِ حقیقی میں تبدیل ہو گیا ہو اور وہ حقیقتاً ہدایت پر آ گئی ہو۔ بہر حال جو لوگ اس بات کو درست تسلیم کرتے ہیں وہ ان آیات کا ترجمہ اسی طرح کرتے ہیں' کیونکہ اس نے اعترافِ جرم کر کے توبہ کر لی تھی اور اس لحاظ سے مذکورہ مفسّرین کا موقف یہ ہے کہ اعترافِ گناہ سے لے کر آیت ۵۳ کے اختتام تک اسی کا بیان ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا موقف (جو دورِ حاضر کے زیادہ تر مفسرین نے اختیار کیا ہے) یہ ہے کہ عزیزِ مصر کی بیوی کا بیان اس آیت پر ختم ہو گیا ہے: ﴿اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۵۱﴾ اور اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا بیان نقل ہوا ہے۔ اس صورت میں آیت ۵۲ اور ۵۳ کا مفہوم یوں ہو گا کہ جب بادشاہ کی تفتیشی کارروائی اور عزیز مصر کی بیوی کے برملا اعترافِ جرم کے بارے میں حضرت یوسفؑ کو بتایا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ اس سب کچھ سے میرا یہ مقصود نہیں تھا کہ کسی کی عزت و ناموس کا پردہ چاک ہو' بلکہ میں تو چاہتا تھا کہ عزیزِ مصر یہ

جان لے کہ اگر اس نے مجھے اپنے گھر میں عزت و اکرام سے رکھا تھا اور مجھ پر اعتماد کیا تھا تو میں نے بھی اس کی عدم موجودگی میں اس کی خیانت کر کے اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی' اور میرا ایمان ہے کہ اللہ خیانت کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ باقی میں خود کو بہت پارسا نہیں سمجھتا بلکہ سمجھتا ہوں کہ نفسِ انسانی تو انسان کو برائی پر ابھارتا ہی ہے اور اس کے حملے سے صرف وہی بچ سکتا ہے جس پر میرا رب اپنی خصوصی نظرِ رحمت فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری حفاظت کا بھی اگر خصوصی انتظام نہ فرمایا جاتا تو مجھ سے بھی غلطی سرزد ہو سکتی تھی۔ مگر چونکہ میرا رب بخشنے والا بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے اس لیے اس نے مجھ پر اپنی خصوصی رحمت فرمائی۔

آیت ۵۴ ﴿وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ﴾ ''اور بادشاہ نے (اب فیصلہ کن انداز میں) کہا کہ اُس کو میرے پاس لے آؤ' میں اُسے اپنا مصاحبِ خاص بناؤں گا۔''

﴿فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۵۴﴾ ''تو جب بادشاہ نے آپؑ سے بات چیت کی تو کہا کہ آج کے دن سے آپؑ ہمارے نزدیک بڑے باعزت اور معتبر انسان ہیں۔''

آج سے آپؑ کا شمار ہمارے خاص مقربین میں ہو گا اور اس لحاظ سے مملکت کے اندر آپؑ کا ایک خاص مقام ہو گا۔ آپ کی امانت و دیانت پر ہمیں پورا پورا بھروسا ہے۔

آیت ۵۵ ﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۵۵﴾ ''آپؑ نے فرمایا کہ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیں' میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور جاننے والا بھی ہوں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام جان چکے تھے کہ اس ملک پر بہت بڑی آفت آنے والی ہے اور اگر اس ممکنہ صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بر وقت درست اور مؤثر اقدام نہ کیے گئے تو نہ صرف خود مصر ایک خوفناک قحط کی زد میں آ جائے گا بلکہ آس پاس کے علاقوں کے لیے بھی بہت بھیانک حالات پیدا ہو جائیں گے۔ اس پورے خطے میں مصر ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں غلّہ اور دوسری اشیائے خوراک پیدا ہوتی تھیں۔ اس کے ہمسایہ میں چاروں طرف خشک صحرائی علاقے تھے اور اناج وغیرہ کے سلسلے میں ان علاقوں کا انحصار بھی مصر کی زراعت پر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ

آپؑ نے موقع دیکھا تو فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں کہ اگر خزانے اور خوراک وزراعت کا پورا انتظام وانصرام میرے پاس ہوگا تو میں اس آفت کا سامنا کرنے کے لیے جامع اور ٹھوس منصوبہ بندی کر سکوں گا۔

آیت ۵۶ ﴿وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ﴾ ''اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو تمکّن عطا کیا (مصر کی) زمین میں' کہ وہ اس میں جہاں چاہے اپنا ٹھکانہ بنا لے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمکّن عطا ہونے کا یہ دوسرا مرحلہ تھا۔ پہلے مرحلے میں آپؑ کو بدوی اور صحرائی ماحول سے اٹھا کر اس دور کے ایک نہایت متمدّن ملک کی اعلیٰ ترین سطح کی سوسائٹی میں پہنچایا گیا' جبکہ دوسرے مرحلے میں آپؑ کو اسی ملک کے اربابِ اختیار و اقتدار کی صف میں ایک نہایت ممتاز مقام عطا کر دیا گیا' جس کے بعد آپؑ پورے اختیار کے ساتھ عزیز کے عہدے پر متمکن ہو گئے۔

﴿نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۶﴾ ''ہم اپنی رحمت سے نوازتے ہیں جس کو چاہتے ہیں اور ہم نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔''

آیت ۵۷ ﴿وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝۵۷﴾ ''اور آخرت کا اجر تو بہت ہی بہتر ہے ان کے لیے جو ایمان لائیں اور تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھیں۔''

اب یہاں سے آگے اس قصے کا ایک نیا باب شروع ہونے جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ آئندہ رکوع کے مضامین اور گزشتہ مضمون کے درمیان زمانی اعتبار سے تقریباً دس سال کا بُعد ہے۔ اب بات اس زمانے سے شروع ہو رہی ہے جب مصر میں بہتر فصلوں کے سات سالہ دور کے بعد قحط پڑ چکا تھا۔ یہاں پر جو تفصیلات چھوڑ دی گئی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر کے عین مطابق سات سال تک مصر میں خوشحالی کا دور دورہ رہا اور فصلوں کی پیداوار معمول سے کہیں بڑھ کر ہوئی۔ اس دوران حضرت یوسف علیہ السلام نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اناج کے بڑے بڑے ذخائر جمع کر لیے تھے۔ چنانچہ جب یہ پورا علاقہ قحط کی لپیٹ میں آیا تو مصر کی حکومت کے پاس نہ صرف اپنے عوام کے لیے بلکہ ملحقہ علاقوں کے لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی اناج وافر مقدار میں موجود تھا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام

نے اس غیر معمولی صورتِ حال کے پیش نظر ''راشن بندی'' کا ایک خاص نظام متعارف کروایا۔ اس نظام کے تحت ایک خاندان کو ایک سال کے لیے صرف اس قدر غلہ دیا جاتا تھا جس قدر ایک اونٹ اٹھا سکتا تھا اور اس کی قیمت اتنی وصول کی جاتی تھی جو وہ آسانی سے ادا کر سکیں۔ ان حالات میں فلسطین میں بھی قحط کا سماں تھا اور وہاں سے بھی لوگ قافلوں کی صورت میں مصر کی طرف غلہ لینے کے لیے آتے تھے۔ ایسے ہی ایک قافلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دس بھائی بھی غلہ لینے مصر پہنچے' جبکہ آپؑ کا ماں جایا بھائی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے اس بیٹے کو کسی طرح بھی ان کے ساتھ کہیں بھیجنے پر آمادہ نہیں تھے۔

آیات ۵۸ تا ۶۸

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۵۸ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝۵۹ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ۝۶۰ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ۝۶۱ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۶۲ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۶۳ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۶۴ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۝۶۵ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝۶۶ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٨﴾

آیت ۵۸ ﴿وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ﴾ ''اور آئے یوسفؑ کے بھائی اور آپؑ کے سامنے پیش ہوئے''

﴿فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٥٨﴾﴾ ''تو آپؑ نے انہیں پہچان لیا مگر وہ آپؑ کو نہیں پہچان پائے۔''

ان حالات میں یہ امکان ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عزیزِ مصر جس کے دربار میں اُن کی پیشی ہو رہی ہے وہ ان کا بھائی یوسف ہے۔

آیت ۵۹ ﴿وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ﴾ ''پھر جب آپؑ نے اُن کا سامان تیار کروا دیا تو فرمایا کہ (آئندہ) اپنے اس بھائی کو بھی میرے پاس لے کر آنا جو تمہارے والد سے (تمہارا بھائی) ہے۔''

غلّہ چونکہ راشن بندی کے تحت دیا جاتا تھا اس لیے انہوں نے درخواست کی ہوگی کہ ہمارا ایک بھائی اور بھی ہے' اس کے اہل خانہ بھی ہیں' اسے ہم اپنے والد کی خدمت کے لیے پیچھے چھوڑ آئے ہیں' اُس کے حصے کا غلّہ بھی ہمیں دے دیا جائے۔ اس سلسلے میں سوال و جواب کے دوران انہوں نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ ہم دس حقیقی بھائی ہیں جبکہ وہ گیارہواں بھائی باپ کی طرف سے سگا لیکن والدہ کی طرف سے سوتیلا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے یہ سارا ماجرا سننے کے بعد فرمایا ہوگا کہ ٹھیک ہے میں آپ کے گیارہویں بھائی کے حصے کا اضافی غلہ تم لوگوں کو اس شرط پر دے دیتا ہوں کہ آئندہ جب تم لوگ غلہ لینے کے لیے آؤ گے تو اپنے اس بھائی کو ساتھ لے کر آؤ گے تاکہ میں تصدیق کر سکوں کہ تم لوگوں نے غلط بیانی کر کے مجھ سے اضافی غلہ تو نہیں لیا۔

﴿اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿٥٩﴾﴾ ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پیمانہ پورا بھر کر دیتا ہوں اور بہترین مہمان نوازی کرنے والا بھی ہوں!''

آیت ۶۰ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿٦٠﴾﴾ ''اور اگر تم

اُسے میرے پاس لے کر نہیں آؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے' اور تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا۔''

آیت ۶۱ ﴿قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ ''انہوں نے کہا کہ ہم اس کے بارے میں اس کے والد کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم یہ ضرور کر کے رہیں گے۔''

آیت ۶۲ ﴿وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ﴾ ''اور یوسفؑ نے اپنے نوجوانوں سے کہا کہ ان کی پونجی (بھی واپس) اُن کے کجاووں میں رکھ دو''

اس زمانے میں چیزوں کے عوض ہی چیزیں خریدی جاتی تھیں۔ چنانچہ وہ لوگ بھی اپنے ہاں سے کچھ چیزیں (بھیڑ بکریوں کی اون وغیرہ) اس مقصد کے لیے لے کر آئے تھے اور غلے کی قیمت کے طور پر اپنی وہ چیزیں انہوں نے پیش کر دی تھیں۔ مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ملازمین کو ہدایت کر دی کہ جب ان کے کجاووں میں گندم بھری جائے تو ان لوگوں کی یہ چیزیں بھی جو انہوں نے غلے کی قیمت کے طور پر ادا کی ہیں چپکے سے واپس ان کے کجاووں میں ہی رکھ دی جائیں۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾ ''تاکہ وہ پہچانیں ان کو جب لوٹیں اپنے اہل و عیال کی طرف' شاید کہ (اس طرح) وہ دوبارہ آئیں۔''

آیت ۶۳ ﴿فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ﴾ ''پھر جب وہ لوٹے اپنے والد کے پاس تو کہنے لگے: اباجان! ہم سے (ایک) پیمانہ روک لیا گیا ہے''

یعنی انہوں نے آئندہ کے لیے ہمارے چھوٹے بھائی کے حصے کا غلہ روک دیا ہے اور وہ تبھی ملے گا جب ہم اس کو وہاں لے کر جائیں گے۔

﴿فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٦٣﴾﴾ ''تو (آئندہ) ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجئے گا تاکہ ہم (اس کے حصے کا بھی) غلہ لے کر آئیں' اور ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔''

آیت ۶۴ ﴿قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ﴾ ''یعقوبؑ نے فرمایا کہ کیا میں اس کے بارے میں اسی طرح تم پر اعتبار کر لوں جیسے میں

نے اس کے بھائی (یوسفؑ) کے بارے میں پہلے تم پر اعتبار کیا تھا؟''

﴿فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''(ویسے تو) اللہ ہی بہترین محافظ ہے اور وہی تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۶۵ ﴿وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ﴾ ''اور جب انہوں نے کھولا اپنا سامان تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی پونجی انہیں لوٹا دی گئی ہے۔''

﴿قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ﴾ ''وہ پکار اٹھے: ابا جان! ہمیں اور کیا چاہیے؟ یہ ہماری پونجی بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔''

﴿وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾﴾ ''(اب ہم جائیں گے) اور اپنے اہل وعیال کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے' اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائیں گے۔ یہ (ایک اضافی) بوجھ (لانا تو اب) بہت آسان ہے۔''

آیت ۶۶ ﴿قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ﴾ ''یعقوبؑ نے فرمایا: میں اسے (واپس) ہرگز نہیں بھیجوں گا تمہارے ساتھ' یہاں تک کہ تم میرے سامنے پختہ قسم کھاؤ اللہ کی کہ تم لازماً اسے لے کر آؤ گے میرے پاس' سوائے اس کے کہ تم سب کو گھیرے میں لے لیا جائے۔''

ہاں اگر کوئی ایسی مصیبت آجائے کہ تم سب کے سب گھیر لیے جاؤ اور وہاں سے گلوخلاصی مشکل ہو جائے تو اور بات ہے' مگر عام حالات میں تم لوگ اسے واپس میرے پاس لانے کے پابند ہو گے۔

﴿فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾﴾ ''پھر جب انہوں نے آپؑ کو اپنا پختہ قول وقرار دے دیا تو یعقوبؑ نے فرمایا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے۔''

آیت ۶۷ ﴿وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ﴾ ''اور آپؑ نے کہا: اے میرے بیٹو! تم لوگ ایک دروازے سے (شہر میں) داخل نہ ہونا بلکہ

متفرق دروازوں سے داخل ہونا۔''

حسد اور نظرِ بد وغیرہ کے اثرات سے بچنے کے لیے بہتر ہے کہ آپ تمام بھائی اکٹھے ایک دروازے سے شہر میں داخل ہونے کے بجائے مختلف دروازوں سے داخل ہوں۔

﴿وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ﴾ ''اور میں تم کو بچا نہیں سکتا اللہ (کے فیصلے) سے کچھ بھی۔''

میں اللہ کے کسی فیصلے کو تم لوگوں سے نہیں ٹال سکتا۔ اگر اللہ کی مشیّت میں تم لوگوں کو کوئی گزند پہنچنا منظور ہے تو میں اُس کو روک نہیں سکتا۔ یہ صرف انسانی کوشش کی حد تک احتیاطی تدابیر ہیں جو ہم اختیار کر سکتے ہیں۔

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''اختیارِ مطلق تو صرف اللہ ہی کا ہے' اُسی پر میں نے توکّل کیا ہے' اور تمام توکّل کرنے والوں کو اُسی پر توکّل کرنا چاہیے۔''

آیت ۶۸ ﴿وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ﴾ ''تو جب وہ داخل ہوئے جہاں سے انہیں حکم دیا تھا ان کے والد نے۔''

﴿مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ﴾ ''وہ (یعقوبؑ) بچانے والا نہیں تھا ان کو اللہ (کے فیصلے) سے کچھ بھی' سوائے اس کے کہ یعقوبؑ کے دل میں ایک خیال تھا جو اُس نے اسے پورا کر لیا۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں ایک کھٹک تھی جسے دور کرنے کے لیے آپؑ نے یہ تدبیر اختیار کی کہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کر دی کہ وہ ایک دروازے سے داخل ہونے کی بجائے مختلف دروازوں سے داخل ہوں' لیکن آپؑ کی یہ تدبیر اللہ کے کسی فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔

﴿وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾﴾ ''اور یقیناً آپؑ صاحبِ علم تھے اُس علم کے اعتبار سے جو ہم نے آپؑ کو سکھایا تھا' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

❀❀❀

کیا انتخابات پاکستان کو بحرانوں سے نکال سکتے ہیں؟

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

تنظیم اسلامی لاہور کے زیر اہتمام ۷/اپریل ۲۰۱۳ء کو قرآن آڈیٹوریم میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا‘ جس میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ نے ”کیا انتخابات پاکستان کو بحرانوں سے نکال سکتے ہیں؟“ کے موضوع پر مفصّل گفتگو فرمائی۔ امیر تنظیم اسلامی کی گفتگو‘ جو دراصل سوال وجواب کی شکل میں تھی‘ کو شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی کے ادارتی معاون حافظ محمد زاہد کی ترتیب وتسوید کے بعد قارئینِ میثاق کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۝ (یونس)

محترم ومعزز حضرات اور قابلِ احترام خواتین!

آج کا یہ پروگرام معمول سے تھوڑا سا ہٹ کر ایک الگ انداز (format) میں تشکیل دیا گیا ہے‘ بایں طور کہ آج کے موضوع ”کیا انتخابات پاکستان کو بحرانوں سے نکال سکتے ہیں؟“ کے حوالے سے محترم مرزا ایوب بیگ مجھ سے کچھ سوالات کریں گے اور میں ان کے جواب دے کر اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو cover کرنے یعنی ان کا احاطہ کرنے کی کوشش کروں گا‘ ان شاء اللہ! آپ کو یہ انداز شاید اتنا عجیب نہ لگے لیکن میرے لیے یہ کچھ انوکھا سا معاملہ ہے۔ لہٰذا میرے حق میں دعا کیجیے گا کہ میں اس انداز میں بھی اپنی بات بہتر اور

درست انداز سے کہہ سکوں۔

ایوب بیگ مرزا: پاکستان اپنے قیام سے لے کر آج تک مختلف بحرانوں کا شکار رہا ہے اور بحران گہرے سے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ حکومتیں جمہوری بھی ہیں اور آمرانہ بھی‘ لیکن کیا وجہ ہے کہ ۶۵ سال کے عرصے میں ہم ان بحرانوں پر قابو نہ پا سکے؟

حافظ عاکف سعید: اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامِ پاکستان سے آج تک یہ ملک مختلف بحرانوں کا شکار ہے‘ بلکہ بحرانوں کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک کو اب مسائلستان کہا جا رہا ہے۔ ۶ اپریل کے نوائے وقت میں آپ نے سابق امریکی سفیر کا یہ بیان پڑھا ہوگا کہ پاکستان تیزی سے ایک ناکام ریاست کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ باتیں تسلسل کے ساتھ کہی جا رہی ہیں اور ہمیں بار بار ایک ناکام ریاست قرار دیا جا رہا ہے۔ اب اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ آج تک ہم ان بحرانوں پر قابو کیوں نہ پا سکے؟ اس کے جواب میں سب سے پہلے میں علامہ اقبال کے دو اشعار آپ کے سامنے پیش کروں گا —— اقبال نے اپنے اشعار میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ اپنی جگہ کافی ہے‘ لیکن مجھے بہرحال کچھ مزید وضاحت بھی کرنا ہوگی —— علّامہ فرماتے ہیں:

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نَسَب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری!

یعنی رسولِ ہاشمی ﷺ کی جو قوم ہے وہ اپنی ترکیب میں خاص ہے‘ اسے دنیا کے دوسرے ممالک کی اقوام پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح پاکستان کے حالات کو سدھارنے کے لیے اگر ہم دنیا کے دوسرے ممالک کی طرف دیکھیں اور اپنے بحرانوں کے حل کے لیے وہاں سے کچھ راہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو یہ یاد رکھیں کہ ہم غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ وہاں سے ہمیں اپنے بحرانوں کا کوئی حل نہیں ملے گا۔ حل وہی ہے جو حکیم الاُمّت تجویز کر رہے ہیں۔ چنانچہ خاص ترکیب میں تو رسولِ ہاشمی ﷺ کی پوری اُمت ہے‘ لیکن اس اُمت میں پاکستان کا ایک خصوصی مقام ہے‘ اس لیے کہ یہ واحد اسلامی ملک ہے جو ایک خاص نظریے یعنی اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے۔ اور پھر پاکستانی قوم بھی قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ میں خاص الخاص ہے——

اس حوالے سے یہ بھی نوٹ کرلیں کہ اسرائیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک نظریاتی ریاست (Ideological State) ہے‘ جبکہ یہ بات امر واقعہ کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ وہ ریاست نسلی بنیادوں پر قائم ہوئی ہے نہ کہ کسی نظریے کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے اسرائیل ایک نسلی ریاست (Racial State) ہے۔

بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے بھی اپنی کتاب ’’استحکامِ پاکستان‘‘ میں ان تمام مسائل کو بیان کیا ہے اور پھر اس کی وجوہات بھی بیان کی ہیں کہ پاکستان مستحکم کیوں نہیں ہو رہا۔ ۸۵۔۱۹۸۴ء کی بات ہے جب بانی محترم کے یہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ یعنی یہ کوئی آج کا مسئلہ نہیں ہے‘ بلکہ یہ ملک مسلسل بحرانوں سے دوچار ہے اور مسلسل غیر مستحکم ہو رہا ہے۔ کہیں ایم آر ڈی کی تحریک‘ کہیں سندھو دیش کی تحریک اور کہیں پختونستان کی تحریک کی صورت میں اسے غیر مستحکم کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ اس سب کی وجہ یہ ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر قائم ہوا‘ لیکن اس کے بعد ہم نے اسلام سے انحراف شروع کر دیا۔ ابتدا میں نفاذِ اسلام کے حوالے سے کچھ کوششیں ضرور ہوئیں۔ اور یا مقبول جان —— اللہ تعالیٰ انہیں اجر وثواب عطا کرے —— انہوں نے یہ بات تاریخ کے اوراق سے نکال کر قوم کے سامنے رکھی ہے کہ قائداعظم نے علامہ اسد جن کا شمار اُس وقت کے چوٹی کے علماء میں ہوتا تھا‘ کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ ملک کے تعلیمی اور معاشی نظام کو اسلامی بنانے کے لیے سفارشات مرتب کریں اور اس کا ایک خاکہ بنائیں۔ اس کے علاوہ قراردادِ مقاصد بھی ابتدا میں پاس ہوگئی تھی‘ جس میں ہم نے اپنی منزل کا تعین بھی کرلیا تھا کہ واقعی یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے‘ اسلام ہی اس کی منزل ہے اور یہاں پر حکمرانی بھی ’’اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ‘‘ کے مصداق صرف اللہ کی ہوگی۔ اس کے بعد ۳۱ علماء کے ۲۲ نکات بھی آ گئے اور ایک متفقہ دستور بھی سامنے آ گیا۔ لیکن پھر ہم اس سارے معاملے کو بھول گئے کہ پاکستان ہم نے کیوں حاصل کیا تھا۔ دوقومی نظریے سے ہم منحرف ہوگئے‘ اللہ سے کیے گئے تمام وعدے ہم نے بھلا دیے اور انگریز کے چھوڑے ہوئے نظام کو ہم نے مقدس گائے کی طرح سنبھال کر رکھا۔ آپ نوٹ کریں کہ آج بھی ہمارا پورے کا پورا ملکی نظام وہی ہے جو انگریز قائم کر کے گیا تھا‘ البتہ تعلیمی نظام میں تھوڑی بہت کتربیونت اور پیش رفت ہوئی تھی‘ لیکن اس کے بعد پھر واپسی کا سفر بھی شروع ہوگیا۔ اس کی تازہ مثال تعلیمی سال ۱۴۔۲۰۱۳ء کے لیے تیار کی گئی دسویں جماعت کی اردو لازمی کی نصابی کتاب ہے جس میں

سے اسلامی روایات‘ تاریخ پاکستان اور دوقومی نظریے پر مشتمل مضامین ختم کرنے کے ساتھ ساتھ قومی وملّی شاعری کو بھی نصاب سے خارج کر کے مکمل طور پر سیکولر بنا دیا گیا ہے☆۔ المیہ یہ ہے کہ یہ سب مسلم لیگ والے کر رہے ہیں جو اسلام اور پاکستان کے ٹھیکیدار سمجھے جاتے ہیں۔ بہرحال ان ۶۵ سال میں اسلام کی طرف کوئی حقیقی عملی پیش رفت نہ ہو سکی۔ ایک دستور بنایا گیا تو وہ بھی منافقت کا پلندہ‘ جس میں ایک طرف اسلام ہے تو دوسری طرف چور دروازے اور غیر اسلامی شقیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ یہ اصل سبب ہے جس کی وجہ سے بحران پیدا ہوئے۔

سورۃ الانفال کی آیات اور ان کا ترجمہ پروگرام کے شروع میں آپ نے سنا‘ ان میں سے آیت ۲۶ قیامِ پاکستان کے حالات پر بہت حد تک منطبق ہوتی ہے‘ جس میں فرمایا گیا:

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۲۶﴾

’’اور (اس وقت کو) یاد کرو جب تم زمین (مکہ) میں قلیل اور ضعیف سمجھے جاتے تھے اور ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ تمہیں اڑا (نہ) لے جائیں (یعنی بے خانماں نہ کر دیں) تو اُس نے تم کو جگہ دی اور اپنی مدد سے تم کو تقویت بخشی اور پاکیزہ چیزیں کھانے کو دیں تاکہ (اس کا) شکر کرو۔‘‘

اُس وقت تو اہلِ مکہ اور اہلِ مدینہ سے کہا گیا تھا کہ اللہ کے اس احسان کو یاد کرو‘ جبکہ بالکل ایسی ہی صورتِ حال قیامِ پاکستان سے قبل مسلمانانِ ہند کی تھی کہ مسلمان انگریز اور ہندو دونوں کی دوہری غلامی کی چکی میں پس رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آزادی عطا فرمائی اور معجزانہ طور پر پاکستان عطا کر دیا۔ اس کی تفصیلات والدِ محترم کی کتاب ’’استحکامِ پاکستان‘‘ میں موجود ہیں۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: ’’لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک علیحدہ خطہ عطا فرمایا تاکہ تم اس کا شکر بجالاؤ اور جس اسلامی نظریے پر پاکستان کو قائم کیا گیا اس کو مستحکم کرو —— اس حوالے سے قائداعظم کے بے شمار بیانات موجود ہیں جن میں انہوں نے اسلامی ریاست کے قیام کی بات کی‘ مثلاً ہمارا دستور چودہ سو سال پہلے طے ہوا‘ قرآن ہمارا دستور ہے‘ پاکستان اسلامی نظام کی ایک تجربہ گاہ ہوگی۔ اس سے بھی بڑھ کر کہا کہ پاکستان پوری دنیا کے

☆ اس کی مکمل تفصیل جاننے کے لیے ہفت روزہ ندائے خلافت کے شمارہ ۱۴ کے اداریے بعنوان: ’’اسلامی جمہوریہ پاکستان کا سیکولر نصابِ تعلیم‘‘ کا مطالعہ کیجیے!

لیے مینارۂ نور بنے گا۔ اور پھر خلافتِ راشدہ کے تصورات کا بھی ذکر ہوا۔ ان تمام باتوں کو میں نے اپنے پچھلے خطاب بعنوان: ''علامہ اقبال اور قائداعظم کا پاکستان: سیکولر یا اسلامک؟'' میں تفصیل سے بیان کیا تھا اور دلائل سے ثابت کیا تھا کہ قائداعظم اور علامہ اقبال پاکستان کی صورت میں ایک اسلامی ملک کا قیام چاہتے تھے☆ ___ ایک طرف یہ سب کچھ ہے اور دوسری طرف انتہائی افسوس کا مقام یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہم اللہ سے کیے گئے تمام وعدوں کو بھول گئے۔

اسی تسلسل میں اس سورۃ کی اگلی آیت بھی ملاحظہ ہو' جس میں فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو''۔ تم نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر ہمیں ایک الگ ریاست مل جائے تو ہم وہاں اللہ کا قانون نافذ کریں گے۔ اب اللہ نے تمہیں پاکستان کی صورت میں ایک الگ خطہ عطا کر دیا' لیکن اس کے بعد تم وعدہ خلافی کر رہے ہو' خیانت کر رہے ہو۔ آگے فرمایا: ﴿وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۲۷﴾ ''اور آپس کی امانتوں میں بھی جانتے بوجھتے خیانت نہ کیا کرو''۔ یعنی نہ تو اللہ اور رسول کے معاملات میں کوئی خیانت کرو اور نہ آپس کے معاملات میں خیانت کرو۔ اگلی آیت میں اس خیانت کا سبب بھی بتا دیا گیا: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (آیت ۲۸) ''اور جان لو کہ مال اور اولاد تمہارے لیے ذریعہ آزمائش ہیں''۔ یعنی مال زیادہ سے زیادہ مل جائے اور اولاد کو زیادہ سے زیادہ آسائشیں فراہم کر دی جائیں' اس فتنے نے تمہیں تباہ و برباد کیا ہے اور اس وجہ سے تم اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدے کو بھی بھول گئے ہو۔

اللہ تعالیٰ سے کی گئی وعدہ خلافی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف پاکستان مختلف بحرانوں کا شکار ہو گیا تو دوسری طرف قوم بے شمار قومیتوں میں بٹ گئی۔ اس حوالے سے نوٹ کر لیں کہ پرویز مشرف کی طرف سے لگایا گیا نعرہ ''سب سے پہلے پاکستان'' بالکل بے معنی نعرہ ہے۔ اس لیے کہ آپ کون سے پاکستان کی بات کر رہے ہیں؟ یہاں تو سندھی کے لیے سب سے پہلے سندھ' بلوچی کے لیے سب سے پہلے بلوچستان' خیبر پختونخوا والوں کے لیے سب سے پہلے پختونستان' کراچی کے مہاجروں کے لیے سب سے پہلے لیاقت پور یا کراچی' اور پنجاب تو بہرحال پنجابیوں

☆ امیر تنظیم اسلامی کا مذکورہ خطاب: ''علامہ اقبال اور قائداعظم کا پاکستان: سیکولر یا اسلامک؟'' میثاق کے آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا' ان شاء اللہ! (ادارہ)

کا ہے ہی۔ تو قوم قومیتوں میں بٹ چکی ہے' ایک قوم کہاں رہ گئی؟ والد محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ وہ قوم جس نے متحد ہو کر پاکستان بنایا تھا' پاکستان بناتے ہی اسلام سے منحرف ہو گئی تو قومیتوں میں بٹ گئی۔ کالاباغ ڈیم کیوں نہیں بن رہا؟ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے پر اعتماد ہی نہیں ہے۔ ایک دوسرے سے بدگمانیاں ہیں' نفرتیں ہیں' کدورتیں ہیں' بغض ہے' عداوتیں ہیں۔ تو یہ ڈیم کیسے بنے گا؟ ملک چاہے تباہ ہو جائے' توانائی کا بحران اپنی انتہا کو پہنچ جائے' پورا ملک اندھیرے میں ڈوب جائے' ہمارے سونا اُگلتے ہوئے کھیت صحرا میں تبدیل ہو جائیں' اور بھارت ہمارے دریاؤں کا پانی کھینچ لے' یہ سب منظور ہے' لیکن کالاباغ ڈیم نہیں بن سکتا۔ یہ بحران کی انتہا (climax) ہے۔

ان بحرانوں کے علاوہ اللہ سے کیے گیے وعدہ کی خلاف ورزی کا ایک نتیجہ ''مرضِ نفاق'' ہے۔ بانی محترمؒ سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ کے حوالے سے فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی سُنّت یہ ہے کہ کوئی قوم اگر وعدہ کرے کہ اے اللہ! تو ہمیں فلاں نعمت عطا کر دے تو ہم تیرے شکرگزار بندے بنیں گے' لیکن جب وہ نعمت عطا ہو جائے اور پھر قوم کی طرف سے ناشکری کی جائے تو ایسی قوم کے افراد کے دلوں میں نفاق کا مرض اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر ڈال دیا جاتا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۷۷﴾

''تو اللہ نے (اس کا انجام یہ کیا کہ) اُس روز تک کے لیے جس میں وہ اللہ کے روبرو حاضر ہوں گے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا' اس لیے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

مسلمانانِ پاکستان کی طرف سے کی گئی وعدہ خلافی کی وجہ سے نفاق کا مرض ہمارے دلوں میں بھی ڈال دیا گیا ہے۔ اس نفاق کی ظاہری علامات' وعدہ خلافی' جھوٹ' بدعہدی' بددیانتی اور کرپشن ہیں جو ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ یہ تمام بحران اور نفاق کا یہ مرض ہمارے اس جرم کے نتیجے میں ہے کہ جس مقصد کے لیے پاکستان بنا تھا اس مقصد کو ہم نے بھلا دیا اور جس نظریے پر پاکستان بنا تھا اس نظریے کو ہم کدالیں اور ہتھوڑے لے کر کھود رہے ہیں' توڑ رہے ہیں اور پوری قوم اسے منہدم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ دیکھئے سیکولرازم جو پاکستان کی مکمل نفی ہے'

اس وقت بحیثیتِ مجموعی اس قوم کا مذہب ہے۔ یہ ملک اسلامی نظریے (Islamic Ideology) پر قائم ہوا ہے اور نظریہ پاکستان درحقیقت اسلام ہی تو ہے۔ ہندو سے ہم الگ کس بنیاد پر تھے‘ حالانکہ نسلیں تو ایک ہی ہیں‘ زبانیں بھی ایک ہی ہیں۔ سندھ میں رہنے والا اور سندھی زبان بولنے والا سندھی ہے‘ خواہ مسلمان ہو یا ہندو۔ پنجابی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے۔ وہی نسلیں اِدھر ہیں‘ وہی نسلیں اُدھر ہیں۔ پھر ہم نے الگ خطہ کیوں مانگا تھا؟ یقیناً ہم نے اس ملک کو اسلام کی بنیاد پر حاصل کیا تھا اور اگر ہم اس نظریے ہی کو کدالوں اور ہتھوڑوں کے ذریعے درہم برہم کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو پاکستان مضبوط کیسے ہو سکتا ہے؟ محض الیکشن کے ذریعے صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی!

آپ دیکھیں جتنے قسم کے عذابوں کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے‘ وہ سب کے سب ہم پر آئے ہیں۔ سورۃ الانعام میں تین عذابوں کا ذکر ہے :﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ ’’کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اس پر کہ بھیج دے عذاب تم پر تمہارے اوپر سے‘‘۔ یعنی اوپر سے بارش ہوتی ہے اور ان بارشوں کے نتیجے میں آنے والے سیلاب عذاب کی ایک شکل ہے۔ ﴿اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ﴾ ’’یا تمہارے قدموں کے نیچے سے (کوئی عذاب بھیج دے)‘‘۔ یعنی زلزلہ آ جائے۔ ابھی پچھلے کچھ عرصہ کے دوران تاریخ کے بدترین سیلاب اور بدترین زلزلے نے ہمیں جھنجھوڑا ہے۔ ﴿اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ﴾ (آیت ۶۵) ’’(اور تیسرا عذاب یہ ہے کہ) تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور ایک دوسرے کی قوت کا مزا چکھائے‘‘۔ یہ ٹارگٹ کلنگ اور خانہ جنگی اسی عذاب کی ایک شکل ہے۔ یہ سب کے سب بدترین عذاب ہیں جو ہم پر آئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سورۃ النحل میں بھوک اور خوف کے جس عذاب کا تذکرہ ہے‘ وہ بھی ہم پر مسلط ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾

’’اور اللہ ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ (ہر طرح) امن چین سے بستی تھی۔ ہر طرف سے رزق بافراغت چلا آتا تھا‘ مگر ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا)

مزہ چکھا دیا۔‘‘

کچھ عرصہ پہلے تک آپ سوچتے ہوں گے کہ خوف کا عذاب کیا ہو سکتا ہے‘ لیکن آج کل دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں جو دہشت کی فضا بنی ہوئی ہے اس سے آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ خوف کا عذاب کیا ہے۔ دوسرے ملکوں سے پاکستانی یہاں آتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ امن وامان کی اس بدترین صورتحال میں یہ ملک تو رہنے کے قابل ہی نہیں۔ یہاں تو کبھی کسی کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں سے گولی آئے اور انسان لقمۂ اجل بن جائے۔ کراچی میں اندھا دھند فائرنگ میں کچھ نہیں دیکھا جاتا‘ محض ایک دہشت پیدا کرنے کے لیے لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے —— اسی طرح بھوک کا عذاب بھی آج ہم پر مسلط ہے۔ عوام کو بنیادی سہولیات ہی میسّر نہیں ہیں اور لوگ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ نہ پالنے کی وجہ سے خودکشیاں کر رہے ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی اقوام پر آنے والے سارے کے سارے عذاب آج ہم پر مسلّط ہیں۔

اسی طرح یہ جان لیجیے کہ نااہل اور ظالم حکمرانوں کا مسلط ہو جانا بھی عذابِ الٰہی کی ایک شکل ہے۔ آپ دیکھئے‘ اس سے پہلے پرویز مشرف تھا جس نے ڈنڈے کے زور پر زبردستی اقتدار حاصل کیا اور پھر امریکہ کے ایجنڈے کو یہاں نافذ کرنا شروع کیا۔ وہ بھی ہمارے ہی گناہوں کی سزا تھی۔ وہ گیا تو سمجھا گیا کہ اب سارے معاملات درست ہو جائیں گے۔ اگلا وہ آیا جس کو پوری قوم کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے ارکانِ اسمبلی کی اکثریت نے ووٹ دے کر اپنے سر پر بٹھایا —— اب بتایئے کس کو الزام دیں‘ کس کو دوش دیں؟ —— وہ اپنے پیش رو سے بھی چار ہاتھ آگے ہے اور انہی پالیسیوں کا تسلسل قائم رکھے ہوئے ہے جو مشرف دور میں چل رہی تھیں۔ لہٰذا الیکشن سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس سے ملک کی قسمت نہیں بدل سکتی‘ بحرانوں کے گرداب سے یہ ملک نہیں نکل سکتا۔ اب بھی صاف نظر آ رہا ہے کہ آئندہ جو حکومت بنے گی وہ بھی امریکہ کی رضامندی سے ہوگی۔ جن کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ مزاحمت کریں گے‘ وہ تو پورے طور پر سرِ تسلیم خم کر کے امریکہ کی گود میں جا چکے ہیں۔ الیکشن کی وجہ سے حالات میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ وقتی طور پر چہروں کی تبدیلی کی وجہ سے عوام کے چند دن نفسیاتی طور پر کچھ آرام سے گزر جاتے ہیں اور ان کے ذہن میں یہ خواب ڈیرے جما لیتے ہیں کہ شاید کچھ تبدیلی آ جائے‘ شاید کچھ بہتری آ جائے‘

لیکن پرنالہ پھر وہیں پر گرتا ہے۔ لہٰذا آپ یہ نوٹ کر لیں کہ الیکشن سے اس ملک کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی!

ایوب بیگ مرزا: آپ کی گفتگو سے بڑی آسانی سے ہر شخص یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ ان بحرانوں کا اصل سبب جمہوری حکومتوں کا انقطاع اور انتخابات کا ہونا یا نہ ہونا نہیں ہے' بلکہ اگر پاکستان میں صاف اور شفاف الیکشن ہو بھی جائیں تب بھی بحران اور مسائل جوں کے توں رہیں گے۔ تو پھر ہماری دینی جماعتیں کس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر انتخابات میں حصہ لیتی ہیں؟

حافظ عاکف سعید: میرے نزدیک ان دینی جماعتوں کا جماعتی (official) موقف یہی ہے کہ وہ پاکستان میں نفاذِ شریعت ہی کی خاطر' جو اس ملک کے مسائل کا اصل حل ہے' انتخابات میں حصہ لیتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ چاہے مولانا فضل الرحمٰن ہوں یا سید منور حسن' ان کے بیانات میں یہ بات پوری شدّومدّ سے سامنے آتی ہے کہ ہمارے تمام مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ اس ملک میں شریعت کا نفاذ ہو اور اس ملک میں اللہ کا دین قائم ہو' لیکن اس کے لیے انہوں نے الیکشن کا راستہ تجویز کر لیا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں سب سے پہلے جماعت اسلامی الیکشن کے میدان میں اُتری تھی اور اس کے بعد دیگر دینی جماعتیں بھی رفتہ رفتہ ''آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!'' کے مصداق اس کے پیچھے پیچھے اسی راستے پر چل پڑی ہیں اور المیہ یہ ہے کہ پاکستان میں انتخابی سیاست کے ذریعے سے اسلام اور شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ پاکستان کے خاص حالات کے پیش نظر یہ طریقہ موزوں نہیں ہے۔ اب ۶۵ سال کے تجربے کے باوجود بھی اگر ہماری مذہبی جماعتیں کوئی سبق حاصل نہیں کرتیں تو میں اس کے سبب کو سمجھنے سے قاصر ہوں' حالانکہ ۶۵ سال میں ثابت ہو گیا ہے کہ اس ذریعے سے اس ملک میں اسلام نہیں آ سکتا۔ یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ والد محترم اس نتیجے پر ۱۹۵۷ء میں پہنچ گئے تھے' اور وہ اکیلے نہیں پہنچے تھے بلکہ جماعت اسلامی کی صف دوم کی قیادت کے بہت سے سینئر لوگ اسی بنیاد پر جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے۔

الیکشن کا راستہ نفاذِ اسلام کے لیے موزوں نہیں ہے' اس حوالے سے نوٹ کر لیں کہ پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو یہاں پر جاگیرداری نظام ہے اور دوسرے یہاں پر اسلام کے نام پر ووٹ تقسیم ہوتے ہیں۔ بے شمار جماعتیں ہیں' مسلک ہیں' فرقے ہیں جو الگ الگ انتخابی نشان کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور پھر الیکشن ہی سے فرقہ وارانہ کشیدگی اور

اختلافات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اصل اسلام ہمارے پاس ہے' ہم اسلام کے اصل ٹھیکیدار ہیں' جبکہ باقی جماعتیں جو اسلام کی نمائندگی کی دعوے دار ہیں' وہ بس دھوکہ دے رہی ہیں۔ پھر یہاں پر برادری سسٹم ہے اور برادری کی بنیاد پر ووٹ دیے جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ مسائل تو اصل جمہوریت کے راستے کی بھی رکاوٹ ہیں۔ تو یہ ساری چیزیں مُساعِد (favourable) نہیں ہیں اور پاکستان میں اس راستے سے اسلام نہیں آ سکتا۔ کسی اور ملک کی ہم بات نہیں کرتے' لیکن اِس ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے الیکشن کا راستہ مفید نہیں ہے۔ اور یہی بات بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ جماعت اسلامی اور دیگر دینی جماعتوں کو بتاتے رہے ہیں کہ آپ اس دلدل سے باہر نکلیں' لیکن وہ اس صحرائے تیہہ میں ابھی تک سرگرداں ہیں۔

میں خاص طور پر یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایم ایم اے (متحدہ مجلسِ عمل) کے تجربے کے بعد بھی کیا اب کوئی گنجائش باقی ہے کہ اسی راستے کو دوبارہ سے منتخب کیا جائے اور اسی کے ذریعے اللہ کے دین کو قائم اور غالب کرنے کی کوشش کی جاتی رہے؟ اس لیے کہ اس موقع پر تو تمام دینی جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی بھی ہو گئی تھیں اور سب نے متفقہ طور پر ایک ہی انتخابی نشان کے تحت الیکشن لڑا تھا۔ اُس وقت حالات بھی بہت سازگار تھے۔ نائن الیون کی وجہ سے امریکہ مخالف رجحان (Anti America Sentiment) بہت زیادہ جاندار تھا اور طالبان موافق رُجحان (Pro Taliban Sentiment) اس وقت بڑی قوت میں تھا — لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس وسیع اتحاد کے باوجود بھی صرف صوبہ سرحد میں ان کی حکومت بنی اور بلوچستان میں کچھ سیٹیں ان کو حاصل ہوئیں' جبکہ جو بڑے صوبے ہیں پنجاب اور سندھ وہاں تو بعض دوسری جماعتوں کے ساتھ سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے باوجود بھی چند سیٹیں ہی حاصل ہوئیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ماضی کے مقابلے میں یہ لوگ سب سے بڑی تعداد میں اسمبلی میں آ گئے تھے۔ اس حوالے سے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اس دور میں کون سا اسلام آیا' کون سی شریعت نافذ ہوئی' کون سا اللہ کا دین قائم ہوا؟ صوبہ سرحد میں تو ان کی حکومت تھی' لیکن وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ انتخابات نفاذِ اسلام کا راستہ ہی نہیں ہیں۔ اب یہ کس توقع میں الیکشن لڑ رہے ہیں' کم سے کم میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اس ایک تجربے کے بعد تو بہت ضروری تھا کہ اس کے بجائے اب کوئی اور راستہ اختیار کیا جاتا۔

اس حوالے سے آپ یہ بھی نوٹ کیجیے کہ متّحدہ مجلس عمل کے دور میں ہی پرویز مشرف نے ''تحفّظِ حقوقِ نسواں بل'' کے نام پر پارلیمنٹ سے ایک ایسا قانون پاس کرایا جس کے بارے میں تمام مسالک کے سو فیصد علماء نے کہا کہ یہ خلافِ اسلام ہے' قرآن وسنت کے خلاف ہے' اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے بغاوت پر مبنی ہے' لیکن وہ بل ہماری اسمبلی نے پاس کیا' اور المیہ یہ ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی متحدہ مجلس عمل اس پارلیمنٹ کا حصہ رہی۔

اس تناظر میں' میں یہ عرض کروں گا کہ ایک بہت بڑی دینی جماعت اس نتیجے پر پہنچی ہے اور اس پر بھی وہ حقیقت آشکار ہوگئی ہے جس پر آج سے ۵۵ سال پہلے بانی محترم پہنچے تھے۔ اس جماعت نے اعلان بھی کیا ہے کہ انتخابات کے راستے سے اسلام نہیں آئے گا اور نفاذِ شریعت کے لیے یہ راستہ موزوں نہیں ہے' لیکن ابھی تک اس طرف رخ نہیں موڑا۔ اس کی تفصیل میں آگے ذکر کروں گا۔ بہرحال دینی جماعتیں ابھی تک اگر اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ اس ذریعے سے اسلام آسکتا ہے تو میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا' وہ جانیں اور اللہ جانے!

ایوب بیگ مرزا : تنظیم اسلامی کا تو الحمدللہ شروع سے ہی یہ موقف (stance) رہا ہے کہ انتخابات اور جمہوری نظام کے ذریعے پاکستان میں اسلام نہیں آسکتا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کا ایک اور طبقہ بھی ووٹ سے مایوس ہے' لیکن وہ ballot سے مایوس ہو کر bullet کی طرف چلا گیا ہے' یعنی اُن کے نزدیک اب یہ کام بندوق کے زور پر کرایا جائے گا۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

حافظ عاکف سعید : جی ہاں! یہ بیلٹ اور اس کے نتائج سے نفرت کا بھی ایک ردّعمل ہو سکتا ہے' میں اس کا انکار نہیں کرتا' کیونکہ پاکستان میں بیلٹ کے ذریعے ہمیشہ سیکولر قوتیں ہی برسرِاقتدار آتی ہیں' اور بدقسمتی سے دینی جماعتیں بھی اگر کچھ سیٹیں حاصل کر پاتی ہیں تو وہ بھی سیکولر جماعتوں کے ساتھ سیٹ ایڈجسٹمنٹ کر کے—— حالانکہ سیکولر جماعتوں کے ساتھ سیٹ ایڈجسٹمنٹ کر کے اگر آپ کچھ سیٹیں حاصل کرتے بھی ہیں تو یہ آپ کے بنیادی نظریے کی نفی ہے—— اب اس سارے طرزِ عمل کا ایک ردّعمل (reaction) بھی ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ بیلٹ کے بجائے بلٹ کی طرف چلے گئے ہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک ایک طبقہ بالکل خلوص سے یہ سمجھتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں بھی اسلامی نظام کا قیام تلوار کے ذریعے ہوا تھا اور اب بھی نفاذِ شریعت کا اصل راستہ تلوار ہی ہے۔ ان کی بات کو بھی آپ اپنی جگہ سمجھئے۔ جو لوگ بندوق کو

اسلام کے غلبے اور نفاذِ شریعت کا ذریعہ سمجھتے ہیں ان کے پاس دلیل بڑی مضبوط ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو رحمۃ للعالمینؐ ہونے کے باوجود تلوار ہاتھ میں لینا پڑی تب جا کر دین قائم ہوا۔ اس کے بغیر دین اتنے وسیع پیمانے پر قائم نہیں ہوا۔ چنانچہ راستہ تو یہی ہے۔ آج تلوار کی جگہ بندوق نے لے لی ہے۔ اسی طرح جہادِ افغانستان کی وجہ سے بھی بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات اور پختہ ہوئی کہ راستہ یہی ہے۔ اس لیے کہ وہاں بھی جہاد کے ذریعے شریعت کا نفاذ عمل میں آیا۔

میں اس کی تفصیل میں نہیں جا رہا' لیکن یہ اپنی جگہ بہت حسّاس (senstive) موضوع ہے۔ بہرحال یہ امر واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی جدّوجہد میں آخری اور فیصلہ کن مرحلہ یہی تھا اور جہاد و قتال کے ذریعے اسلام بطور دین کے غالب ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی ایک شخص کو بھی جبراً مسلمان نہیں کیا گیا' البتہ نظام کو جبراً بدلا گیا ہے۔ ایک زمانے میں اگر ''کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ'' کا حکم تھا کہ زبان سے دعوت دیتے رہو' حق بات کہتے رہو' ماریں کھاؤ' لیکن ہاتھ نہ اٹھاؤ' تو اس کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ کھولے بھی گئے' صرف کھولے ہی نہیں گئے بلکہ قتال کی فرضیت ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ﴾ کا حکم بھی آیا۔ بہرحال پاکستان کے مخصوص حالات کی بنا پر ہم بلٹ کے راستے کو مناسب اور قابلِ عمل (feasible) نہیں سمجھتے۔ ذرا غور سے سنیے گا' کیونکہ مسئلہ بڑا حسّاس نوعیت کا ہے۔

عہدِ نبویؐ اور آج کے دور میں ایک بہت بڑا فرق ہے' بایں طور کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تو مسلمانوں کا مقابلہ براہِ راست کھلے کفار اور مشرکین کے ساتھ تھا' جبکہ آج اس ملک میں نفاذِ شریعت کے راستے کی رکاوٹ ہندو' سکھ یا عیسائی نہیں' بلکہ خود کلمہ گو مسلمان ہیں—— جیسا کہ اس سے پہلے بھی میں نے کئی دفعہ عرض کیا اور آج بھی عرض کر رہا ہوں کہ جس شخص نے اس ملک کو اور اس کی اسلامی بنیادوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا' اللہ اسے مزید ذلیل کرے گا' اس نے کہا تھا کہ میں بھی مسلمان ہوں' میں بھی مؤمن ہوں اور میں نے بیت اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تھا۔ وہ سب سے بڑا اسلام دشمن ہے۔ بہرحال وہ تو ایک انتہا پر ہے' لیکن عوام کا حال یہ ہے کہ ان کی عظیم اکثریت انہی سیکولر طبقات کو ووٹ دیتی ہے اور ان کی اپنی زندگیوں میں بھی اسلام کہیں ہے نہیں۔ اگرچہ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی صحیح راہنمائی ہی نہیں کی گئی' منبر و محراب کا صحیح استعمال ہی نہیں کیا گیا' لیکن یہ حقیقت

ہے کہ عملاً وہ خود بھی سیکولر ہیں اور سیکولر قوتوں ہی کو ووٹ دیتے ہیں— بہرکیف یہاں پر اگر بندوق اٹھائی جائے گی تو مسلمانوں کے خلاف اٹھائی جائے گی' جبکہ کسی کلمہ گو مسلمان پر ہاتھ اُٹھانا' اس کی جان لینا' اس کا خون بہانا بہت ہی سنگین معاملہ ہے۔ حضرت اُسامہ ؓ کا واقعہ آپ کے ذہن میں آیا ہوگا کہ ایک غزوہ میں انہوں نے کفار کے ایک شخص کو پچھاڑا تو اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ انہیں یقین تھا اور ان کا یقین ۹۹ فیصد صحیح ہوگا کہ اس نے جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا ہے' اس لیے کہ وہ ان کے قابو میں تھا اور یہ اسے قتل کرنے لگے تھے۔ اس نے کلمہ پڑھ لیا' لیکن آپؓ کی تلوار نہیں رکی اور آپؓ نے اسے قتل کر دیا۔ آنحضور ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو آپؐ سخت ناراض اور غضب ناک ہوئے اور فرمایا کہ قیامت کے دن یہ کلمہ تمہارے خلاف استغاثہ کے طور پر آئے گا تو تم کیا جواب دو گے؟ کیا تم نے اس کا دل چیر کے دیکھ لیا تھا کہ اس نے خلوصِ نیت سے کلمہ نہیں پڑھا تھا؟

بہرکیف مسئلہ بہت سنگین اور بہت حساس ہے' تاہم پھر بھی کچھ شرائط کے ساتھ امام ابوحنیفہ ؒ کا فتویٰ ہے جس کے ہم قائل ہیں کہ فاسق وفاجر مسلمان حکمران کے خلاف بھی تلوار اٹھائی جاسکتی ہے' اس کے خلاف خروج ہوسکتا ہے۔ اُس زمانے میں بغاوت کا ایک طریقہ ممکن تھا' اس لیے کہ ریاست اور حکومت ایک ہی تھے۔ آج کی دنیا کا تصور ذرا تبدیل ہوگیا ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا۔ لیکن خروج کے لیے شرائط اتنی کڑی ہیں جن کو آج کے دور میں ہم پورا کر ہی نہیں سکتے۔ کم سے کم پاکستان کے حالات میں وہ شرائط پوری نہیں ہو سکتیں۔ البتہ اگر حالات بدل جائیں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے' لیکن موجودہ حالات میں ان شرائط کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے۔ وہ شرائط یہ ہیں کہ کوئی جماعت یا طبقہ بغاوت کے لیے کھڑا ہو تو وہ تعداد اور اسلحے کے اعتبار سے اتنا مضبوط اور طاقتور ہو کہ جب وہ کسی مسلمان حکمران کے خلاف بغاوت کرے تو انہیں کامیابی کا یقین ہو۔ دنیوی حساب کتاب (calculation) کے اعتبار سے یہ اصول صحیح ہے اور آج بھی جہاں ایسی کوئی شکل بنے گی تو پھر بندوق کا راستہ اصولی طور پر اختیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں اس کا امکان ہمیں نظر نہیں آتا' اس لیے کہ عوام نہتے ہیں اور حکومت کے پاس ساری قوت ہے۔ حکومت کے پاس رینجرز' پولیس اور پھر انٹیلی جنس اداروں کی ایک بڑی تعداد ہے اور اسلحہ بھی ان کے پاس ایسا ہے جو عوام کے پاس نہیں ہے۔ اگرچہ حکومت کی اپنی نااہلی کی وجہ سے کراچی میں بھی اسلام دشمن طاقتوں نے بہت کچھ اسلحہ اکٹھا

کر لیا ہے' بعض علاقوں میں فوج سے بھی مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں — یہ ایک الگ داستانِ غم ہے — لیکن عام حالات میں کوئی بھی تحریک اُٹھے تو اس کے پاس اتنی قوت ہو نہیں سکتی کہ وہ اس شرط کو پورا کر سکے' لہٰذا بندوق کا یہ طریقہ ہمارے ہاں مفید اور قابلِ عمل نہیں ہے۔

ایوب بیگ مرزا: آپ نے واضح کیا کہ پاکستان میں نہ تو ووٹ (ballot) کے ذریعے سے اسلام ایک نظام کی حیثیت سے آسکتا ہے اور نہ گولی (bullet) کا ذریعہ ہی اس کے لیے قابلِ عمل (feasible) ہے' بلکہ آپ نے تو ناممکن کا لفظ استعمال کیا ہے' تو پھر آپ کون سا راستہ تجویز کرتے ہیں جس سے پاکستان میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نفاذ ہو سکے؟

حافظ عاکف سعید: راستہ وہی ہے جس کی جانب بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ گزشتہ تیس برسوں سے قوم کو متوجہ کر رہے تھے اور وہ یہ ہے کہ ایک بھرپور عوامی تحریک برپا کی جائے جو باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ یہ ایک انقلابی راستہ ہے اور آج کے دور میں بھی عوامی قوت کو نظام کی تبدیلی کا مؤثر راستہ مانا جاتا ہے' لیکن اس عوامی تحریک میں عوام اپنے ہاتھ میں ہتھیار نہیں لیں گے بلکہ پُرامن عوامی تحریک ہوگی۔ جس کی ایک بڑی نمایاں مثال انقلابِ ایران کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ رضا شاہ پہلوی ایران کا شہنشاہ تھا اور صحیح معنوں میں ایک مضبوط شہنشاہ تھا۔ اس پورے خطے کے اندر ہتھیاروں کا سب سے بڑا ذخیرہ اس کے پاس تھا اور وہ اس علاقے کے اندر امریکہ کا ''پولیس مین'' تھا۔ وہاں بیلٹ اور بلٹ کا استعمال نہیں ہوا' بلکہ ایک عوامی تحریک چلی' لوگوں نے جانیں دیں' تب جا کر انہیں کامیابی ملی۔ اس راستے میں قربانی دینی پڑتی ہے اور انقلاب تو آتا ہی خون دے کر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اس تحریک میں کسی مسلمان کا خون خود نہیں بہائیں گے' لیکن جب آپ براہِ راست مسلح تصادم کرتے ہیں تو اپنی جان کو تو خطرہ (risk) میں ڈالتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو پابندِ سلاسل کر دیا جائے اور قید خانوں میں آپ کو تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔ یہ سب کچھ تو ہوگا۔ لیکن آپ اپنے ہاتھ بندھے رکھیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ایران کے انقلاب میں ۲۰ سے ۲۵ ہزار لوگوں نے جانیں دی ہیں' لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہنشاہِ ایران کا مضبوط تخت عوامی سیلاب کے ریلے میں بہہ گیا اور شہنشاہِ ایران کے ساتھ تو وہ معاملہ ہوا کہ ع ''دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں!''

پھر اس عوامی تحریک کے لیے ایک بہت اہم شرط یہ ہے کہ نفاذ شریعت کے لیے جو تحریک چلے گی وہ ایسے نہیں چلے گی کہ کسی جذباتی نعرے کے تحت عوام کے جذبات بھڑکا کر ایک ہجوم

اکٹھا کرلیا جائے‘ بلکہ سب سے پہلے ایک مضبوط انقلابی جماعت تیار کرنی ہوگی‘ جو ایسے افراد پر مشتمل ہو جو شریعت کے لیے جان و مال کی قربانی کے لیے تیار ہوں اور سب سے پہلے اس کے ثبوت کے طور پر اپنے وجود پر اور اپنے گھروں میں شریعت کو نافذ کر چکے ہیں۔ اس کے بغیر اسلام آباد میں شریعت کا پرچم لہرانے کا خواب دیکھنا انتہائی نامعقول بات ہے کہ ہم اسلام آباد میں تو شریعت کا پرچم لہرانے چلے ہیں‘ لیکن اپنے وجود پر شریعت کو قائم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اسی طریقے سے انقلابی جماعت سمع وطاعت کی پابند ہو جو امیر کے ایک اشارے پر حرکت کرے۔ پھر اس جماعت کی تربیت ہوگی‘ اسے منظم کیا جائے گا اور پھر بھرپور دعوت کے ذریعے اصل انقلابی پیغام کو عام کیا جائے گا جو نفاذِ شریعت کی اہمیت پر مبنی ہوگا۔ پھر لوگوں کو بتایا جائے گا کہ اللہ کے عطا کردہ نظام کے سوا کوئی بھی دوسرا نظام اگر اس زمین پر رائج ہے تو وہ اللہ کے ساتھ بغاوت ہے۔ وہ نظام طاغوت اور باطل ہے‘ چاہے وہ نظام بظاہر کتنا ہی خوبصورت نظر آتا ہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے‘ وہ مالک بھی ہے اور خالق بھی‘ تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر حکومت بھی صرف اللہ ہی کی ہو اور قانون بھی اسی کا چلے۔ اگر کوئی اور قانون ہے تو یہ رب سے بغاوت ہے اور اس بغاوت کو کچلنا ہر بندۂ مؤمن کا دینی فریضہ ہے۔

میں ایک بار پھر اس کا اعادہ کروں گا کہ نفاذِ شریعت کے لیے ایک عوامی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ایک منظم اور تربیت یافتہ جماعت نہ ہو اور پھر وہ جماعت اتنی مضبوط ہو جائے کہ ؏ ’’چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!‘‘ تب اگلے مرحلے کی طرف پیش رفت ہوگی۔ پھر وہ ہر مرحلے پر اس ہجوم (mob) کو بھی سنبھال سکے جو اس کے ساتھ اس عوامی تحریک میں شریک ہو رہا ہے۔ پھر جب اس عوامی قوت سے وہ تخت الٹ جائے یا عوامی سیلاب کے ریلے میں بہہ جائے تو وہ جماعت اس کے بعد کے حالات کو کنٹرول کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہو۔ اگر یہ تمام شرائط موجود ہوں گی تو پھر یہ طریقہ سب سے مؤثر ہے۔ اس کی مثال ایرانی انقلاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اسی طریقے سے کرغیزستان اور وینزویلا میں بھی جمے ہوئے تخت عوامی ریلے کے نتیجے میں بہہ گئے۔

اس کی جزوی مثال ہمارے ہاں ججز کی بحالی کے لیے وکلاء کی تحریک ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک طویل عرصے تک انہوں نے اپنے خاص مقصد کے لیے بڑی قربانیاں دیں‘ ایثار کیا‘ مظاہرے کرتے رہے‘ پابندیوں کے باوجود گرمیوں میں نکلتے رہے‘ لاٹھیاں بھی کھائیں‘

بالآخر ان کو کامیابی ملی۔ اپنے جائز حقوق کو منوانے کے لیے یہ راستہ بہت موزوں ہے۔ کیا یہ حق جائز نہیں ہے کہ اس زمین پر اللہ ہی کی حکمرانی ہونی چاہیے! پاکستان کے دستور میں بھی لکھا ہوا ہے کہ یہاں اللہ کی حکمرانی ہوگی‘ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں ہوگی‘ لیکن ہمیں تو اپنا دستوری حق بھی نہیں دیا جا رہا۔ اس کے خلاف ہم ایک بھرپور عوامی تحریک چلانے کا حق بھی رکھتے ہیں اور راستہ بھی یہی ہے جو مختصر طور پر میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے ثبوت کے طور پر میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ بانی محترمؒ تیس سال سے یہ بات کہتے رہے ہیں اور دینی جماعتوں سے ان کی ہمیشہ اپیل رہی ہے کہ الیکشن کے راستے کو چھوڑ کر مل کر ایک بھرپور عوامی تحریک چلائیں تو ان شاء اللہ منزل دور نہیں ہے۔

اس تحریک کو چلانے کے لیے شرائط وہی رہیں گی جو قبل ازیں بیان کر دی گئی ہیں‘ اور دینی جماعتوں پر مشتمل تحریک یہ شرائط پوری کر سکتی ہے۔ دینی جماعتوں کا تو مقصد ہی نفاذِ شریعت ہے اور پھر ان کے پاس پہلے ہی سے جان نثار (dovoted) کارکن موجود ہیں جو اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اسی کو streamline کرنے سے ایک عظیم جماعت حاصل ہو جائے گی جو باطل کے نظام سے ٹکرانے اور نفاذِ شریعت کے لیے ناگزیر ہے۔

پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کی دینی جماعتیں نفاذِ شریعت کی خاطر انتخابات کے ذریعے اسمبلیوں میں آتی رہی ہیں‘ لیکن اس ذریعے سے ایک فیصد بھی اسلام کی طرف پیش رفت نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ان ہی جماعتوں نے جب بھی کسی دینی مسئلہ پر مل کر کوئی تحریک چلائی ہے تو انہیں کامیابی ملی ہے۔ یہ ایک آزمودہ راستہ ہے۔ مثلاً ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے خلاف چلائی گئی تحریک جس کی قیادت ایک غیر سیاسی شخصیت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے ہاتھ میں تھی‘ اس میں بھرپور کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی طرح دو تین سال پہلے تحفظِ ناموسِ رسالتؐ تحریک چلی جس میں تمام دینی جماعتوں نے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو کر ایک بھرپور تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کے تحت اجتماعات‘ جلسے اور ریلیاں شروع ہوئیں۔ دھرنے کا اعلان کرنے والے تھے کہ حکومت نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ان تاریخی حقائق سے بھی ثابت ہے کہ یہ راستہ آزمودہ ہے اور یہی قابل عمل ہے‘ لیکن مجھے نہیں سمجھ آ رہا‘ میں اس حوالے سے اپنے فہم کی عاجزی کا اعتراف کرتا ہوں کہ دینی جماعتیں نفاذِ شریعت کے لیے اس راستے کو کیوں نہیں اختیار کرتیں؟ جمہوریت کی بحالی کے لیے اور مارشل لاء کے خلاف ان لوگوں نے

تحریکیں چلائی ہیں، جیلیں بھی کاٹی ہیں، کوڑے بھی کھائے ہیں، سختیاں بھی برداشت کی ہیں، تو نفاذِ شریعت کے لیے اس راستے کو کیوں نہیں اختیار کیا جاتا؟

میں اس سے پہلے بھی کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ بھارت میں بھی اس کی ایک مثال موجود ہے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بھی شریعت کے حوالے سے اپنے عائلی قوانین کے لیے ایک تحریک چلائی حالانکہ وہ اس ملک میں اقلیت میں ہیں اور صرف ۱۲ فیصد ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیابی عطا کی اور راجیو گاندھی کی حکومت کو صحیح معنوں میں گھٹنے ٹیکنے پڑے اور انہیں مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمانوں کے عائلی قوانین میں ہندوستان کی بڑی سے بڑی عدالت بھی مداخلت نہیں کر سکے گی۔

قبل ازیں میں نے یہ بات عرض کی تھی کہ پاکستان کی ایک بڑی دینی جماعت اب الیکشن سے بددل ہو چکی ہے اور وہ اس کا اعلان بھی کر چکی ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک کا ایک بہت بڑا اور معتبر و مؤثر دینی طبقہ دیوبند مکتب فکر ہے جس کی نمائندگی سیاسی میدان میں ''جے یو آئی'' (جمعیت علمائے اسلام) کرتی ہے — اصل میں تو ان کے مدارس ہیں، علماء ہیں اور یہ تو علمِ دین پھیلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں — ان کے اکابر نے تین سال پہلے ۱۵/اپریل کو ایک اعلامیہ مرتّب کیا تھا۔ کئی دن جامعہ اشرفیہ میں اجلاس ہوتے رہے اور پورے پاکستان سے اکابر دیوبند اس میں شریک ہوتے رہے — یہ دن ہمیں اس لیے نہیں بھول سکتے کہ والد محترم کا انتقال انہی دنوں ۱۴/اپریل کو ہوا تھا اور اس دن بھی اجلاس ہو رہا تھا۔ تبھی بہت سارے جید علماء اس جنازے میں بھی شریک ہو سکے تھے — دیوبند کے اکابر علماء اور جے یو آئی کی اعلیٰ قیادت نے ساری صورتحال پر غور کرنے کے بعد جو متفقہ اعلامیہ مرتب کیا اس کی کاپی میرے پاس موجود ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور تنظیم اسلامی کی جو فکر میں نے آج آپ کے سامنے پیش کی، اس اعلامیہ سے اُس کی سو فیصد تائید ہوتی ہے۔ میں اس اعلامیہ کے چند نکات آپ کو پڑھ کر سنا رہا ہوں:

> ''ملک بھر کے علماء کا یہ اجتماع عام مسلمانوں کے اس احساس میں برابر کا شریک ہے کہ ہمارا ملک جن گونا گوں مسائل سے دوچار ہے اور اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نفاذِ اسلام کے جس عظیم مقصد کے لیے یہ مملکت خداداد پاکستان حاصل کی گئی تھی اس کی

> طرف سے مجرمانہ غفلت برتی گئی ہے۔ (سو فیصد وہی بات ہے جو ہم کہہ رہے ہیں) اور عملاً اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے ہم اس منزل سے دور ہوتے چلے گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک بھر میں عوام ہمہ جہتی مسائل کی چکّی میں پِس رہے ہیں۔''

آگے اس اعلامیہ میں سارے بحرانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد دو نکات میں اس حوالے سے وہ اپنا حل بتا رہے ہیں:

> ''اس بات پر ہمارا ایمان غیر متزلزل ہے کہ اسلام ہی نے یہ ملک بنایا تھا اور اسلام ہی اسے بچا سکتا ہے۔ لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ اس ملک میں اسلامی تعلیمات اور قوانین کو نافذ کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور ملکی آئین کا اہم ترین تقاضا بھی ہے۔''

ایک طرف انہوں نے کہا کہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے، لیکن انہیں معلوم بھی ہے کہ اس نے تو کرنا نہیں تو پھر اگلا نکتہ انہوں نے بیان کیا:

> ''پاکستان کی تمام سیاسی اور دینی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے دوسرے مقاصد پر نفاذِ شریعت کے مطالبے کو اوّلیت دے کر حکومت پر دباؤ ڈالیں اور اس غرض کے لیے مؤثر مگر پُرامن جِدّوجُہد کا اہتمام کریں۔ اور عوام کا فرض ہے کہ جو جماعتیں اور ادارے اس مقصد کے لیے جِدّوجُہد کریں، ان کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔''

اس اعلامیہ سے تنظیم اسلامی کے آج سے تیس سال پہلے دیے گئے موقف کی مکمل تائید ہوتی ہے۔ حکومت پر عوام کی طرف سے دباؤ ڈالنا بھی دراصل قوت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ ایک طریقہ تلوار اور بندوق کا ہے اور ایک عوامی دباؤ کا، لیکن اس کے تقاضے وہی ہیں جو میں نے آپ کو بتا دیے ہیں۔ اگر سب کچھ اس طور سے ہو گا تب وہ مؤثر ہو گا۔

اس حوالے سے یہ بھی نوٹ کر لیں کہ اس کام کے لیے جو جماعت بنے گی اس کی تربیت کا نظام، اس کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کی جِدّوجُہد کے مراحل وغیرہ، یہ ساری چیزیں ہمیں سیرتِ

نبویؐ سے اَخذ کرنا ہوں گی۔ کیونکہ دین اسلام کا قیام اور نفاذِ شریعت کا اہتمام نبی اکرمﷺ کا مشن ہے تو اس کے لیے رہنمائی بھی سیرتِ نبویؐ سے ہی لینی ہوگی۔ الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق دی ہے کہ منہجِ نبوی کے مطابق آج کے دور میں اس جدّوجُہد کو لے کر ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ والدِ محترم کی کتاب ''رسولِ انقلاب ﷺ کا طریق انقلاب'' کا مطالعہ ضرور کریں۔ ویسے تو اسی موضوع پر ایک ضخیم کتاب بعنوان: ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' بھی ہے جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے' لیکن اسی کا خلاصہ ''رسولِ انقلاب ﷺ کا طریق انقلاب'' میں موجود ہے جس کا میں نے آپ کی سہولت کے لیے ذکر کر دیا ہے اور الحمدللہ مکتب دیوبند نے بھی اس کی بالکل سو فیصد تائید کر دی ہے: ع ''متفق گردید رائے بوعلی بارائے من''۔ اگرچہ ابھی بھی ان کی طرف سے اس میں ایک بہت بڑی کمی ہے کہ صحیح تشخیص اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کے بعد اب بھی وہ چل اسی پرانی ڈگر پر رہے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے۔ میں تو ان سے مؤدبانہ التجا کروں گا کہ آپ نے صحیح رہنمائی کی ہے' اب اسی رہنمائی کے حوالے سے اپنا رخ بھی اسی طرف کیجیے۔ اسی کے مطابق اپنی جدّوجُہد کو اس ملک میں غلبہ اسلام کے لیے آگے بڑھائیے۔

اس تناظر میں یہ سوال آپ کے ذہن میں آئے گا کہ انقلابی طریقہ سے شریعت کے نفاذ کے بعد کون سا طرزِ حکومت ہمارے سامنے آئے گا' کیا صدارتی نظام ہوگا یا خلافت کا نظام؟ اور پھر یہ نظام علماء کی شوریٰ سے قائم ہوگا یا عام آدمی کی رائے کو بھی اس میں اہمیت ہوگی؟ اس حوالے سے میں یہ بتا دوں کہ اصل فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ کُل اجتماعی نظام پر قرآن وسنت کی بالادستی قائم ہو۔ چاہے وہ سیاسی نظام ہو یا معاشی' معاشرتی نظام ہو یا عدالتی' یا پولیس اور فوج کے لیے قوانین بنائے جائیں۔ الغرض مکمل اجتماعی نظام قرآن وسنت کے مطابق ہو جائے تو اس کو ہم اسلامی نظام کہیں گے۔ اُس کے بعد اس کے نیچے سیاسی ڈھانچہ کیا ہوگا' اس میں ایک سے زیادہ آراء پائی جاتی ہیں۔ بانی محترمؒ کی رائے یہ تھی کہ صدارتی نظام دورِ خلافتِ راشدہ سے زیادہ قریب ہے۔ بہرحال ہمیں دورِ خلافت راشدہ سے قریب تر نظام ہی لینا ہوگا' لیکن اُس میں یہ بات طے ہو کہ حکمرانی صرف اللہ کی ہوگی اور پورے ملک میں کوئی قانون بھی قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جاسکے گا۔ یہ اصل چیز ہے' اب نیچے کا سیاسی ڈھانچہ باہم مشاورت سے طے کیا جاسکتا ہے۔

ایوب بیگ مرزا : آپ کی اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام اسی راستے سے آ سکتا ہے اور یقیناً جو لوگ یہ کام بطور کارکن کریں گے اور جو لوگ اس معاملے میں رہبری کا فریضہ سرانجام دیں گے' انہیں اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف سے اجرِ عظیم ملے گا' اس میں تو کوئی شک نہیں' لیکن پاکستان جو اس وقت تقریباً ہر قسم کے بحرانوں کا شکار ہے تو اسلامی نظام ان کو کیسے حل کرے گا؟

حافظ عاکف سعید :سب سے پہلے تو ہمارا پختہ ایمان ہونا چاہیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے وعدوں پر۔ چنانچہ سورۃ النور کی ''آیت استخلاف'' میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے وعدہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠﴾ (آیت ۵۵)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے' ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔''

یعنی پہلا وعدہ تو یہ ہے کہ اگر ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں حکومت واقتدار تمہیں ہی دے گا۔ یہی وعدہ سورۂ آل عمران میں ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۹﴾ ''اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو گے''۔ لیکن المیہ یہی ہے کہ ہم ایمان اور عملِ صالح کے تقاضے پورے نہیں کر رہے۔ اگر ہم وہ تقاضے پورے کریں تو اللہ کی طرف سے ایک وعدہ یہ ہے: ﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ ''اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے وہ مستحکم و پائیدار کر دے گا''۔ یعنی وہ دین صرف کتابوں میں نہیں رہ جائے گا بلکہ واقعی طور پر وہ دین مستحکم (establish) ہو جائے گا اور اس کی برکات ظاہر ہوں گی۔ ان برکات میں سے ایک برکت کا ذکر اس آیت میں بھی کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ لازماً ان کی خوف کی حالت کو امن کی حالت سے بدل دے گا''۔ یعنی اس کا سب سے پہلا نتیجہ تو امن وامان کی صورت میں نکلے گا۔ اس طرح ایک بہت بڑا بحران تو حل ہو گیا کہ خوف ودہشت کی ہر سو چھائی ہوئی فضا امن وامان کی فضا میں تبدیل ہو جائے گی۔

اسی طرح سورۃ المائدۃ میں نفاذِ شریعت کے حوالے سے اہلِ کتاب سے کیے گئے اللہ

ربّ العزت کے وعدے کا بیان ہے جو کسی بھی قوم کے معاشی بحران کو ختم کرنے کے حوالے سے ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ﴾

’’اور اگر یہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو اور جو کچھ ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا تو کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے۔‘‘

آج ہم بھی تو وہی کر رہے ہیں جو یہود نے اپنے دور میں کیا تھا۔ شریعت ان کے پاس موجود تھی‘ لیکن وہ اسے اپنی زندگیوں اور ملک میں نافذ نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی اس پر عمل ہو رہا تھا‘ لیکن بہرحال یہ اللہ کا وعدہ موجود تھا کہ اگر وہ اللہ کی شریعت کو نافذ کرتے تو کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور قدموں کے نیچے سے بھی۔ یعنی زمین بھی اپنے خزانے اُگل دیتی اور آسمان سے بھی برکتیں نازل ہوتیں۔ یہی وعدہ آج ہمارے لیے بھی ہے۔ چنانچہ دورِ خلافت راشدہ اس کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے۔ جب اس دور میں دین قائم ہو گیا اور اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی نافذ ہو گیا تو یہ ساری برکات آئی ہیں۔ امن و امان بھی تھا‘ خوشحالی بھی تھی‘ فراوانی بھی تھی۔ لوگ زکوٰۃ لے کر پھر رہے ہیں کوئی لینے والا نہیں ہے۔ لوگوں کو بنیادی ضروریات بھی حاصل تھیں اور بنیادی حقوق بھی۔ اس حوالے سے آنحضورﷺ کا یہ فرمان بھی ملاحظہ ہو۔ آپﷺ نے فرمایا:

((اِقَامَةُ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ مَطَرِ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً فِيْ بِلَادِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) (۱)

’’حدود اللہ میں سے کسی ایک حد کا قائم کرنا اللہ کے کسی شہر میں چالیس روز کی مسلسل بارش سے زیادہ بابرکت ہے۔‘‘

آپ صحرا کا تصور کیجیے کہ وہاں پر چالیس روز تک اگر مسلسل بارش برسے تو پھر وہ زمین لہلہا اُٹھے گی‘ لیکن اللہ کی حدود میں سے ایک حد کو قائم کرنے کے اثرات معاشرے میں اس سے بھی زیادہ خوشگوار ہوں گے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ نفاذِ شریعت پر ربّ العالمین کی طرف سے ملنے والی برکات کا کامل ترین نمونہ ہمیں دورِ خلافت راشدہ میں نظر آتا ہے‘ لیکن اس کی ایک جھلک اس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے اِتمامِ حجت کے لیے ہمیں دکھا دی ہے۔ طالبان نے افغانستان میں شریعت کو

(۱) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الحدود‘ باب اقامۃ الحدود۔

نافذ کیا‘ اللہ تعالیٰ کے قوانین اور حدود کو نافذ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکات کا ظہور ہوا جسے ساری دنیا نے دیکھا۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ان پر ہر طرف سے بندش تھی‘ کوئی مدد نہیں پہنچ سکتی تھی‘ ان کے آمدنی کے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ پھر دیکھیے گزشتہ بیس سال کے دوران اس ملک میں جو حالات گزرے تھے وہ آپ سب کو پتا ہے کہ پہلے روس کے خلاف طویل جہاد اور پھر مجاہدین کی آپس کی خانہ جنگی سے ملک کا تو پہلے ہی تورابورا ہو چکا تھا۔ وسائل نہ ہونے کے برابر تھے‘ لیکن طالبان نے جب شریعت کا نفاذ کیا تو دنیا نے دیکھا کہ امیر المؤمنین کے ایک حکم سے پوست کی کاشت یکسر ختم ہو گئی —— جو اب سارے مل کر بھی زور لگائیں تو قیامت تک ختم نہیں کر سکتے —— اس کے بعد اس خطے میں امن و امان قائم ہو گیا‘ اسلحہ سے پاک (weapon free) سوسائٹی انہوں نے قائم کر کے دکھا دی‘ جرائم کا خاتمہ ہو گیا۔ الغرض ایسی ایسی برکات ہیں کہ جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

اس کی ایک بہت بڑی مثال ڈاکٹر جاوید اقبال کی گواہی ہے —— کہا جاتا ہے: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ ’’اصل گواہی وہ ہے جو دشمن دے‘‘ —— ڈاکٹر جاوید اقبال سیکولر لبرل خیالات کے مالک ہیں۔ وہ تو واقعی ملائیت اور تقلید کے دشمن ہیں اور اُنہیں ان دو چیزوں سے شدید نفرت ہے۔ اس ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ افغانستان گئے ہیں اور جانا بھی اتفاقاً ہو گیا‘ لیکن وہاں پر جب انہوں نے امن و امان کی صورتحال دیکھی‘ فوری انصاف ملتا دیکھا‘ جرائم فری سوسائٹی دیکھی تو واپس آ کر بیان دیتے ہیں —— میں اگر یہ بیان دوں تو اس کی وہ قدر (value) نہیں ہے۔ میرے بیان کے مقابلے میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کی قدر و قیمت لاکھ گنا زیادہ ہے —— انہوں نے کہا کہ ایسی ہی مثالیں جیسی طالبانِ افغانستان نے شریعت کو نافذ کر کے قائم کی ہیں‘ اگر دو چار اور اسلامی ممالک بھی پیش کر دیں تو پوری دنیا مسلمان ہو جائے گی۔

یہ ہیں برکتیں نفاذِ شریعت کی! آج پاکستان میں اگر صحیح معنوں میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی (Politico-Socio-Economic System of Justice) قائم ہو جائے اور اللہ کی اس زمین پر صحیح معنوں میں اُسی کا قانون نافذ ہو جائے تو پھر سارے کے سارے بحران ختم ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ!

قرآن مجید: ایک محفوظ ترین پناہ گاہ

حافظ محمد مشتاق ربانی

سورۃ الکہف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٧﴾﴾

''اور جو آپ کے رب کی کتاب میں سے آپ کی طرف وحی کی گئی ہے (یعنی قرآن) اس کی تلاوت کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کے کلمات کو بدلنے والا کوئی نہیں' اور اس کے علاوہ آپ کہیں پناہ نہیں پائیں گے۔''

سورۃ الکہف کی زیر مطالعہ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ ملے گی۔ اس مضمون میں ہم لفظ مُلْتَحَد کو اپنی توجہ کا مرکز و محور بنا رہے ہیں' جس کے معنی پناہ گاہ کے ہیں۔ سورۃ الجن میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ مُلْتَحَد آیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾﴾

''(اے پیغمبرﷺ!) کہہ دیجیے کہ اللہ کے عذاب سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکتا (یہ بات دوسروں کو سمجھانے کے لیے ہے) اور میں اُس کے سوا کہیں جائے پناہ نہیں دیکھتا۔''

سورۃ التوبہ میں فرمایا: ﴿اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ﴾ (آیت ۱۱۸) ''کہ اللہ سے خود اس کے سوا کوئی پناہ دینے والا نہیں۔''

متذکرہ بالا دونوں مقامات پر لفظ ''مُلْتَحَد'' اللہ تعالیٰ کے لیے آیا ہے' لیکن خود قرآن کو ''مُلْتَحَد'' کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے' اس لیے کہ کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے قرآن کو ''مثلِ حق'' قرار دیا ہے ؎

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں!

ہم دیکھتے ہیں کہ دورِ حاضر میں بہت سے گمراہ کن نظریات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے

اثرات سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ قرآن حکیم اور سُنّتِ نبویؐ کے سائے میں پناہ لی جائے۔ نبی مکرمﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا:

((تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ ، لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا : كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ)) (۱)

''میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' جب تک تم ان کو تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے: اللہ کی کتاب اور اس کے نبیﷺ کی سُنّت۔''

الحاد کے دور میں یہ مضبوط سہارا ہیں۔ از روئے حدیث نبویؐ فتنوں سے بچنے کا ایک ہی ''مخرج'' قرآن ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (الاسراء:۹) ''یہ کتاب اُس راستے کی راہنمائی کرتی ہے جو بالکل سیدھا ہے''۔ اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ اس کتاب کی تعلیمات نہایت واضح ہیں۔ مُلْتَحَد اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ شاید اسی کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو' تیرے عفو بندہ نواز میں!

اور قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' لہٰذا قرآن میں بھی وہی وصف پایا جاتا ہے کہ یہ بندہ مؤمن کو امان فراہم کرتا ہے' حصار میں رکھتا ہے' اسے گمراہی سے بچاتا ہے' باطنی اور خارجی وسوسوں سے بچاتا ہے۔ گویا یہ اہلِ ایمان کے لیے حصنِ حصین ہے۔ قرآن کریم **الھدیٰ** بھی ہے' **الذکر** بھی اور **الشّفاء** بھی۔

سورۃ الکہف میں اصحاب کہف کا قصہ بطور خاص آیا ہے۔ اسی مناسبت سے لفظ مُلْتَحَد کو سمجھئے کہ جیسے اصحاب کہف کے لیے غار بچاؤ کا ذریعہ بنا اسی طرح ہر دور کے نظری و فکری فتنوں سے بچاؤ کے لیے قرآن حکیم غار اور کمین گاہ کا کام دے گا۔ یہ نہ صرف فکری مسائل میں اہلِ ایمان کی راہنمائی کرتا ہے' بلکہ انبیاء اور اہل ایمان کے قصص کے ذریعے سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھاتا ہے۔ ان کی تثبیت قلبی کا ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے انہیں حوصلہ ملتا ہے اور یقین کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس قرآن سے وہ فکر پھوٹتا ہے جس کے سامنے سارے افکار ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے شاگرد جناب خضر یٰسین اپنی کتاب ''**منہاج الفرقان بین علم اللّٰہ وعلم الانسان**'' (اردو) میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کو جب تک 'مُلْتَحَد' کی حیثیت سے قبول نہ کر لیا جائے اس کی 'الوہی

(۱) موطأ امام مالک' کتاب الجامع' باب النھی عن القول بالقدر۔

ہدایت‘ کے حصول اور وقوع کا امکان معدوم رہتا ہے۔ ہر ’ہدایت‘ مُلْتَحَد نہیں ہوتی۔ مُلْتَحَد فقط مامون ترین ہدایت ہوتی ہے۔‘‘

قرآن حکیم ہمارے حق میں اسی صورت میں مُلْتَحَد ہوسکتا ہے جب ہم اس کے سائے (shelter) میں پناہ لیں۔ اس وحی پر عمل کریں تب ہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے لیے ملجا و ماویٰ ہوگی' جیسا کہ آیت کے آغاز میں آیا: ﴿وَاتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ کِتَابِ رَبِّکَ ۚ﴾ تلاوت کا مفہوم پیروی کرنا اور عمل کرنا ہے' نہ کہ صرف خالی ناظرہ خوانی پر اکتفا کرنا۔ اگرچہ ناظرہ خوانی بھی حصولِ ثواب کا ذریعہ ہے' لیکن ہمیں تو اس دنیا میں شیطان کی چالوں اور اس کے پھیلائے ہوئے فتنوں سے بھی بچنا ہے' جو قرآن کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہے۔

تہذیبِ حاضر میں بڑی کشش ہے اور اس کا جلوہ انسان کو فوراً اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ جن نظریات پر یہ استوار ہے ان نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ ادارے اور انسٹیٹیوٹ ہیں۔ حکومتوں کی زیرِ سرپرستی ان اداروں کو چلایا جاتا ہے۔ اس دجّالیت پر مبنی کلچر اور ثقافت سے ہم جلد مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ہم اسی صورت میں اس دجل اور فریب سے بچ سکتے ہیں جب قرآن سے اپنے آپ کو باندھ لیں' قرآن کی صحبت میں آجائیں۔ قرآن تو الفرقان ہے' جو غلط اور درست میں تمیز کرتا ہے۔ یہ الذکر ہے جو گمراہ کن فکر سے فوراً متنبہ کرتا ہے۔ جب ہم اس کو سمجھنے بیٹھیں تو ہمیں قرآن کی عظمت اور اس کی رفعت کو اپنے اوپر سوار کرنا چاہیے۔ خالی الذہن ہوکر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہم اس کے سامنے ''اُمّی'' بن جائیں' تاکہ یہ ہمارے لیے ہدایت کا باعث بنے۔ مخصوص mindset کے ساتھ اس کو ہرگز نہ پڑھیں۔ اپنی سوچ اور اپنے عمل کو درست کرنے کی غرض سے مطالعہ کریں۔

قرآن کے سائے میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی قراءت سے قبل استعاذہ پوری حاضر دماغی سے پڑھا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۹۸﴾﴾ (النحل)

''پس جب قرآن پڑھو تو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو شیطان مردود سے۔''

مشہور مستشرق ڈاکٹر جیری میلر (Gary Miller) قرآن کو پڑھنے سے قبل استعاذہ کی ہدایت سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اس حیرانگی کا اظہار اپنی کتاب The Amazing Qur 'an میں کیا ہے۔ اس کے نزدیک اس نوع کے امور قرآن کے اعجاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر میلر سمجھا کہ اس قسم کی ہدایات کوئی انسان اپنی کتاب پڑھنے سے قبل نہیں دے سکتا' لٰہذا یہ اللہ کی کتاب ہے۔

قرآن مجید کی آخری دو سورتوں کا نام ہی معوذتین ہے' یعنی دو پناہ میں رکھنے والی سورتیں: الفلق اور النّاس۔ ان کو پڑھنے اور ان کا وظیفہ کرنے سے انسان شیطان سے بچ جاتا ہے۔ وہ اندرونی وسوسوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح بیرونی حملوں سے بھی حفاظت میں رہتا ہے۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ فتنہ دجال بہت زور آور فتنہ ہے' جس کے بارے میں احادیثِ نبویہ میں بڑی صراحت آئی ہے۔ وہ ایک ایسا فتنہ ہے جس سے انبیاءِ کرام ﷺ بچنے کی دعا کرتے رہے۔ اس فتنہ سے بچنے کے لیے سورۃ الکہف بطور وظیفہ ہے۔ سورۃ الکہف میں مختلف فتنوں کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے فِتنۃُ الدِّین ہے جو اصحاب کہف کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ اس سے بچاؤ کا ذریعہ یہ ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کی جائے اور ثابت قدم رہا جائے۔ اس کے بعد فتنۃُ المَال کا بیان ہے جو دو آدمیوں کے تذکرے کے ساتھ آیا ہے۔ ایک صاحب مال ہے جس کے دو باغ ہیں اور دوسرا شخص مفلس' لیکن ایمان اور روحانیت سے متصف ہے۔ یہ مفلس دنیا کی چمک دمک سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ مادہ پرستی کے دور میں بھی توحید اور امید کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ تیسرا فتنہ فتنۃُ العلم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے ضمن میں بیان ہوا ہے۔ اس فتنہ سے بچنے کے لیے عاجزی اختیار کرنے اور علم کے سلسلے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے کا نسخہ بتایا گیا ہے۔ چوتھا اور آخری فِتنۃُ السُّلْطان ہے کہ انسان اقتدار اور اختیار کے نشہ میں آ کر لوگوں کے حقوق غصب کرتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ذوالقرنین کا کردار سامنے رہنا چاہیے۔ گویا یہ پوری سورت فتنوں سے بچنے کے لیے ایک پناہ گاہ ہے۔ اس کا فہم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے سے انسان پناہ میں آجاتا ہے۔

ظاہری پناہ گاہ کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں قرآن سب سے زیادہ اور خاص اہمیت کا حامل ہے' جیسا کہ کلام اللہ میں بیان ہے کہ مشرکین میں سے کوئی دار الحرب سے دارالاسلام آئے اور امان کا طلب گار ہو تو ایسے شخص کو امان دی جائے' لیکن اس کو قرآن کی تعلیمات بتائی جائیں تاکہ اس کے مسلمان ہونے کے امکانات بڑھ جائیں اور اسلام کے بارے اس کی دلچسپی بڑھے۔ اس کے ذہن میں موجود اسلام کے بارے میں تعصب دُور ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ اسۡتَجَارَکَ فَاَجِرۡہُ حَتّٰی یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبۡلِغۡہُ مَاۡمَنَہٗ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَعۡلَمُوۡنَ ٪﴿۶﴾﴾ (التوبۃ)

''اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ کلام اللہ سننے لگے' پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو۔ اس لیے کہ یہ بے خبر لوگ ہیں۔''

گویا پناہ دینے کے ساتھ کلام اللہ سنانے یعنی سمجھانے کو جوڑ دیا گیا ہے۔ ❀❀

برائی کو طاقت سے روکنا

علامہ یوسف القرضاوی   ترجمہ: ارشادالرحمٰن

سوال: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر‘ یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی کو روکنا دینی طبقات کے نزدیک ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ اس میں بھی برائی (منکر) کو بزورِ قوت روکنے کا مسئلہ زیادہ اہم ہے‘ اور اسی طرح یہ بات بھی کہ برائی کو روکنے کا یہ حق کسے حاصل ہے اور یہ کب جائز ہوتا ہے؟

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حق فقط اہلِ اقتدار کو حاصل ہے‘ یعنی یہ حکومت کی ذمہ داری میں شامل ہے‘ افراد کی ذمہ داری نہیں ہے‘ کیونکہ اگر یہ حق افراد کے پاس ہو تو معاشرے میں فساد رونما ہو سکتا ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ برائی کو روکنا ہر مسلمان کے فرائض میں شامل ہے۔ ان کی دلیل یہ صحیح حدیثِ رسولؐ ہے:

’’تم میں سے کوئی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ کی طاقت سے بدل دے۔ اگر کوئی یہ طاقت اپنے اندر نہ رکھتا ہو تو وہ اپنی زبان سے کام لے۔ اور اگر کوئی اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے دل میں اسے برا سمجھے۔ اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے‘‘۔ (مسلم‘ عن ابی سعید الخدری ؓ)

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قوی ترین ایمان پر قادر ہے تو وہ اس کے ضعیف ترین درجے پر کیوں راضی ہو جائے؟ یہ وہ رجحان ہے جو انجام اور نتائج کی پروا کیے بغیر برائی کو روکنے کے حوالے سے بعض جذباتی نوجوانوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ اہلِ اقتدار اور حکومت خود برائی کا ارتکاب کرتی ہے‘ یا اس کی پشت پناہی کرتی ہے‘ حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہراتی ہے‘ یا فرائض کو ساقط کرتی ہے‘ یا حدود سے تجاوز کرتی ہے‘ یا حق سے دشمنی رکھتی ہے اور باطل کو رواج دیتی ہے‘ تو ایسی صورتِ حال میں افراد پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کوشش میں اگر افراد کوئی نقصان اٹھاتے ہیں تو وہ اللہ کی خاطر ہو گا‘ اگر قتل کر دیے جائیں گے تو فی سبیل اللہ شہادت ہو گی اور حدیثِ رسول کے مطابق وہ سیّد الشہداء حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی ہمسائیگی میں جگہ پائیں گے۔

دونوں طرف کے ان دلائل کی بنا پر بہت سے لوگوں خصوصاً غیرت مند دین پسند نوجوانوں کے لیے یہ معاملہ کچھ الجھ سا گیا ہے۔ جو لوگ پہلے موقف کے قائل ہیں کہ برائی کو روکنے کا اختیار اہلِ اقتدار کے پاس ہے‘ عموماً وہ لوگ ہیں جن کو سرکاری علماء کہا جاتا ہے اور عوام میں ان کی بات کو کوئی اہمیت اور وزن حاصل نہیں ہوتا‘ جب کہ دوسرا گروہ جو برائی کو بزورِ قوت روکنے کا قائل ہے‘ یہ سب وہ نوجوان ہیں جن کو انتہا پسند‘ جذباتی اور شریعت کا ظاہری مفہوم لینے کا الزام دیا جاتا ہے۔

گزارش ہے کہ صحیح رائے کی نشان دہی کریں۔ ہو سکتا ہے دونوں ہی درست ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں درست نہ ہوں‘ بلکہ تیسری رائے درست ہو جو ان کے علاوہ ہو۔

جواب: نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا فریضہ اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔ یہ وہ فریضہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مُسلمہ کی فضیلت کے دو بڑے اسباب میں سے ایک قرار دیا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط﴾ (آلِ عمران: ۱۱۰)

’’اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو‘ بدی سے روکتے ہو‘ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

قرآن مجید کی نظر میں مؤمنوں کی اساسی صفات یہ ہیں:

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ط﴾ (التوبۃ: ۱۱۲)

’’اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے‘ اُس کی بندگی بجالانے والے‘ اُس کی تعریف کے گن گانے والے‘ اُس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے‘ اُس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے‘ نیکی کا حکم دینے والے‘ بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔‘‘

قرآنِ مجید نے جس طرح نیکی کا حکم دینے والوں اور برائی سے روکنے والوں کی تعریف کی ہے‘ اسی طرح ان لوگوں کی مذمت بھی کی ہے جو نیکی کا حکم نہیں دیتے اور برائی سے نہیں روکتے:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ)

’’بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤدؑ اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی' کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا' برا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔‘‘

مذکورہ آیت کے مطالعے کی روشنی میں مسلمان صرف انفرادی حیثیت ہی میں صالح انسان نہیں ہوتا' جو اچھے کام کرتا ہے' برائی سے بچتا ہے اور اپنے ایک خاص دائرے میں زندگی گزارتا ہے' نہ اسے یہ فکر ہو کہ خیر کا دائرہ سمٹ رہا ہے اور اسے بے وقعت بنایا جا رہا ہے' نہ اسے یہ پریشانی ہو کہ برائی اس کے ارد گرد پھیل رہی ہے اور پَر پُرزے نکال رہی ہے۔ بلکہ ہر مسلمان اپنی ذات میں ایسا صالح انسان ہوتا ہے جس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ اوروں کی بھی اصلاح کرے۔ اسی بات کو قرآنِ مجید کی مختصر سورۃ' سورۃ العصر میں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾

’’زمانے کی قسم' انسان درحقیقت خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔‘‘

جو مسلمان دنیا و آخرت میں خسارے سے دوچار ہو جائے' اس کے لیے نجات ممکن نہیں۔ نجات اگر مسلمان کا مقدر بن سکتی ہے تو صرف اسی صورت میں جب وہ حق اور صبر کی تلقین کا فریضہ ادا کرے اور یہی وہ چیز ہے جس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی نام دیا گیا ہے۔ مسلمان امت مسلمہ میں حق و خیر کا محافظ اور نگران ہے۔

مسلم معاشرے میں برائی صرف اِسی صورت میں ہوتی ہے جب معاشرہ غفلت کا شکار ہو جائے یا ضعف اور انتشار سے دوچار ہو جائے۔ ایسی صورتِ حال میں یہ معاشرہ نہ قائم رہ سکتا ہے اور نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ بھی خیال نہیں کر سکتا اور اپنے ان دگرگوں حالات کی بنا پر کسی قانون کے نفاذ سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

برائی' مسلم معاشرے میں غیر مقبول عنصر کے طور پر ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ جیسے پھانسی یا عمر قید کے سزا یافتہ مجرم کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ ماورائے عدالت اور معاشرے سے چھپ چھپا کر زندگی گزارتا اور نقل و حرکت کرتا ہے۔ لہٰذا مسلمان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ برائی کے

سامنے اُس وقت تک مزاحمت کرے اور اُسے روکے' جب تک اس کا ایسے علاقے سے خاتمہ نہیں ہو جاتا جو علاقہ برائی کو پسند کرنے والوں کا نہیں' بلکہ مسلمانوں کی سرزمین ہے۔

مذکورہ حدیثِ رسولؐ کا مطلب بالکل واضح ہے کہ برائی کو روکنا ہر اُس مسلمان کا حق بلکہ فریضہ ہے جو اسے دیکھ لے۔ اس بات کے فرض اور واجب ہونے کی دلیل حدیث میں مذکور لفظ مَنْ ہے' یعنی مَنْ رَاٰی (جو بھی دیکھے) عام الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ ہر اُس شخص کے لیے ہیں جو برائی کو دیکھے' وہ شخص حاکم ہو یا محکوم۔ رسول اللہ ﷺ نے تو تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ بات فرمائی ہے' یعنی مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا (تم میں سے جو شخص بھی برائی کو دیکھے۔) آپ ﷺ نے اس میں سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا' صحابہ کرامؓ سے لے کر قیامت تک آنے والی امت مسلمہ کی تمام نسلیں اس میں شامل ہیں۔ یہ برائی کو دیکھنے والا امت کا رہنما' سربراہ اور حاکم بھی ہو سکتا ہے اور عوام میں سے کوئی فرد بھی ہو سکتا ہے۔ ان میں سے جو بھی برائی کو دیکھے وہ طاقت کے مطابق اسے روکنے کی کوشش کرے۔

برائی کو روکنے کی شرائط

برائی کو روکنے کے حوالے سے مسلم فرد یا مسلم جماعت کو جن لازمی شرائط کا خیال رکھنا واجب ہے اور جن کی طرف حدیث کے الفاظ اشارہ کرتے ہیں وہ شرائط حسب ذیل ہیں:

☆ حرام اور متفقہ منکر: پہلی شرط یہ ہے کہ وہ برائی متفقہ طور پر حرام کاموں میں شامل ہو' یعنی وہ برائی حقیقتاً منکر ہو۔ اس سے مراد وہ برائی ہے جس کو اوّلاً ہاتھ کی طاقت سے' پھر زبان سے اور پھر دل سے روکنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ حدیث میں مذکور لفظ منکر (برائی) کا اِطلاق صرف اس حرام کے اوپر ہی کیا جاتا ہے جس کو چھوڑنے کا شارع نے تاکیدی حکم دیا ہو' جب کہ اس حرام کا ارتکاب کرنے والا عذابِ الٰہی کا مستحق بھی ٹھہرتا ہو' اور پھر اس حرام کا تعلق منع کیے گئے حرام کاموں کا ارتکاب کرنے سے ہو یا انجام دیے جانے والے امور کو چھوڑ دینے سے۔ اس منکر کا تعلق محرماتِ صغیرہ (چھوٹے حرام امور) سے ہو یا محرماتِ کبیرہ (بڑے حرام امور) سے۔ اگرچہ محرماتِ صغیرہ کے بارے میں تساہل سے کام لیا جاتا ہے' لیکن محرماتِ کبیرہ کے متعلق ایسا تساہل نہیں پایا جاتا' خصوصاً اُس وقت جب ان منکرات کا مرتکب ان کا عادی بھی نہ ہو۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا

كَرِيْمًا﴿٣١﴾ (النساء)

’’اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔‘‘

رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا:

’’پانچ نمازیں‘ جمعہ سے اگلے جمعہ تک اور رمضان سے اگلے رمضان تک کے درمیانی عرصے کے گناہوں کو محو کر دیتی ہیں‘ اگر تم کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرو۔‘‘ (مسلم‘ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

لہٰذا مکروہ افعال کا ارتکاب اور مسنون اور مستحب اعمال کو ترک کر دینے کا فعل منکر میں داخل نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ صحیح احادیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے فرائضِ اسلام کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اس کے سامنے نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ کے فرائض بیان کیے۔ یہ شخص ہر فرض کے ذکر کے بعد آپ ﷺ سے پوچھتا تھا کہ کیا اس کے علاوہ بھی کچھ میرے اوپر فرض ہے؟ آپ ﷺ اسے جواب دیتے: اگر تم نفلی طور پر کچھ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ رسول اللہ ﷺ اپنی بات سے فارغ ہوئے تو اُس شخص نے کہا: اللہ کی قسم یا رسول اللہ ﷺ! میں نہ اس سے کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں کوئی کمی کروں گا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ نجات پا گیا‘‘۔ یا آپ ﷺ کے الفاظ تھے: ’’اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ جنت میں داخل ہو گیا‘‘۔ (بخاری‘ مسلم‘ عن طلحہ بن عبید اللہ)۔ ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: ’’جو شخص کسی جنتی آدمی کو دیکھ کر خوش ہونا چاہے وہ اس آدمی کو دیکھ لے‘‘۔ (بخاری‘ مسلم‘ عن ابی ہریرہ)۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ منکر جس کو روکنے کا مسئلہ درپیش ہو‘ وہ حرام کے درجے میں آتا ہو اور شریعت کی رو سے حقیقتاً منکر ہو۔ شریعت کے ٹھوس اور واضح الفاظ یا قطعی قواعد وضوابط سے اس کا منکر ہونا ثابت ہو۔ اس منکر کا منکر ہونا محض رائے اور اجتہاد سے ثابت نہ ہوتا ہو‘ کیونکہ رائے اور اجتہاد درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ یہ زمانے‘ مقام اور حالات ورواج کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس برائی کے منکر ہونے پر سب کا اتفاق ہو۔ ایسے امور جن کے بارے میں قدیم یا جدید علماءِ اجتہاد کا اختلاف ہو‘ یعنی اس امر کے جائز ہونے اور ممنوع ہونے کے بارے میں علماء متفق نہ ہوں‘ تو یہ اس منکر کے دائرے میں داخل نہیں جس کو

ہاتھ کی قوت سے روکنا‘ خصوصاً انفرادی سطح پر روکنا واجب ہے۔

تصویر‘ آلات یا غیر آلات کی موسیقی‘ عورت کا چہرے اور ہتھیلیوں کو نہ چھپانا‘ عورت کا عدالتی امور کے مناصب پر تقرر‘ ایک ہی دن روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا معاملہ جو مطالع کے اختلاف کی وجہ سے سامنے آتا ہے‘ چاند کو آنکھ سے مشاہدہ کرنا یا ریڈار اور کیلنڈر وغیرہ کی مدد سے یہ حساب قائم کرنا وغیرہ ایسے امور اور مسائل ہیں جن کے بارے میں قدیم اور جدید فقہاء کا طول طویل اختلاف موجود ہے۔ ان امور میں کسی مسلمان فرد یا مسلمان جماعت کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ کسی ایک رائے کو اختیار کر کے دوسروں کو سختی کے ساتھ اس پر مجبور کرے۔

یہاں تک کہ جمہور اکثریت کی رائے اقلیت کی رائے کو ساقط اور بے اعتبار نہیں کر سکتی خواہ مخالفت میں صرف ایک فرد ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ فرد اہلِ اجتہاد میں سے ہو‘ یعنی اس کے اندر مجتہدانہ صفات اور صلاحیتیں موجود ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے اور عہد میں ایک رائے متروک ہوتی ہے‘ لیکن کسی دوسرے عہد میں اس کا رواج ہو جاتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی فقیہہ کی رائے کو اس کے دور میں ضعیف قرار دیا گیا اور بعد میں کوئی پیدا ہوا جس نے اس رائے پر دلائل قائم کیے اور اس کو صحیح اور قوی کے مقام پر لا کھڑا کیا۔ پھر یہی رائے قابل اعتماد قرار پائی اور اسی کی بنیاد پر فتوے دیے جانے لگے۔

طلاق اور خاندانی معاملات میں امام ابن تیمیہؒ کی آراء کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ اُنہیں زندگی بھر ان آراء کی وجہ سے قید وبند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وفات کے بعد بھی صدیوں اُن کی رائے کے خلاف مزاحمت ہوتی رہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے پھیلنے کے اسباب پیدا فرمائے اور یہی آراء بہت سے اسلامی ممالک میں فتویٰ‘ عدالت اور قانون سازی کے شعبوں میں سند قرار پائیں۔

وہ منکر جس کو طاقت سے روکنا واجب ہے‘ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ثابت اور بیّن منکر ہو۔ مسلمان ائمہ کا اس کے منکر ہونے پر اتفاق ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا روکنا شر کے لامتناہی سلسلے کا باعث نہ بن جائے۔ لہٰذا جو شخص بھی برائی کو روکنے کے بارے میں رائے رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ وہ لوگوں کو آمادہ کرے کہ وہ اس برائی کو طاقت سے روک دیں۔

بعض اسلامی ممالک میں جوشیلے اور جذباتی نوجوانوں کے گروپ بنے ہوئے ہیں تاکہ ان دکانوں کی توڑ پھوڑ کریں جو بچوں کے کھلونے اور گڑیائیں فروخت کرتی ہیں۔ ان نوجوانوں

کا خیال ہے کہ یہ کھلونے اور گڑیائیں بُت ہیں اور مجسمے کی شکلیں ہیں جو کبائر میں بھی سب سے اوپر کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب ان نوجوانوں سے کہا جاتا ہے کہ قدیم علماء نے بچوں کے کھلونوں کی اجازت دی ہے کیونکہ ان میں تو صورت (تصویر) کی توہین اور اس کی تعظیم کی نفی ہے۔ اس پر نوجوانوں کا جواب ہوتا ہے کہ یہ رائے تو قدیم کھلونوں کے بارے میں تھی‘ اب تو تصویر کی کامل تر صورت سامنے آ گئی ہے‘ جس میں کھلونا آنکھیں کھول سکتا اور بند کر سکتا ہے۔ جب ان نوجوانوں سے یہ کہا گیا کہ بچہ تو ان کھلونوں کو دائیں‘ بائیں پھینکتا ہے‘ ان کا بازو توڑ دیتا ہے‘ ٹانگ الگ کر دیتا ہے‘ وہ تو انہیں تعظیم واحترام یا تقدس نہیں دیتا‘ تو ان نوجوانوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

اسی طرح کئی اسلامی ممالک میں بعض نوجوانوں نے رمضان کا چاند نظر آ جانے پر ہوٹلوں‘ جوس کی دکانوں اور قہوہ خانوں کو جبراً بند کرانے کی کوشش کی۔ ان جذباتی نوجوانوں کا خیال تھا کہ رمضان شروع ہو چکا لہٰذا اب کھلے عام کھانا پینا جائز نہیں۔ ایسا ہی واقعہ مصر میں بھی عیدالفطر کے موقع پر پیش آیا تھا‘ جب دینی حلقوں نے مختلف دلائل کی بنیاد پر یہ کہا تھا کہ شوال شروع نہیں ہوا۔ مطلع ابر آلود ہونے کے سبب اس رات چاند کی رویت ممکن نہیں تھی‘ لہٰذا مصر میں چاند دکھائی نہ دیا۔ مگر بعض حلقوں نے چاند نظر آ جانے کا اعلان کر دیا‘ تو کچھ نوجوانوں نے اصرار کیا کہ وہ روزہ چھوڑ دیں گے اور قوم کی اکثریت اور حکومت کے علی الرغم عید منائیں گے۔ اس موقع پر امن فورسز کے ساتھ تصادم ہو گیا جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میری رائے میں یہ لوگ درج ذیل وجوہات کی بنا پر خطا کے مرتکب ہوئے ہیں:

۱) فقہاء کی آراء چاند کی رویت پر اعتماد کرنے کے حوالے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے کسی نے ایک شہادت کو کافی سمجھا ہے‘ کسی نے دو شہادتوں کا مطالبہ کیا ہے اور کسی نے صاف مطلع میں جم غفیر کی شہادت کی شرط عائد کی ہے۔ ان میں سے ہر کسی کے اپنے دلائل اور اپنا زاویہ نظر ہے۔ لہٰذا لوگوں کو بغیر کسی قوتِ نافذہ کے ایک طریقے پر مجبور کرنا جائز نہیں۔

۲) اسی طرح ان فقہاء کا اختلافِ مطالع کے اعتبار اور عدم اعتبار کے مسئلے میں بھی اختلاف ہے۔ متعدد فقہی مذاہب کی رائے یہ ہے کہ ہر علاقے کی رویت اپنی ہے۔ کسی ایک علاقے کے لیے کسی دوسرے علاقے کی رویت پر عمل کرنا لازمی نہیں ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ اور ان کے موافقین کا مذہب ہے‘ جیسا کہ یہ مسلم میں حضرت کریب ؓ کی حدیث سے معروف ہے۔

۳) اختلافی امور میں حکمران یا قاضی کا حکم اختلاف کا خاتمہ کر دیتا ہے اور قوم کے لیے اس کا حکم

ماننا لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح کے مسائل میں جب مقتدر قانونی قوتیں کسی امام کے قول یا اجتہاد کو اختیار کر لیں تو ان کی پیروی فرض اور قوم کے اندر فرقہ بازی ممنوع ہو جاتی ہے۔

میں نے اپنے بعض فتاویٰ میں کہا ہے کہ اگر ہم رمضان کا روزہ شروع کرنے اور عید منانے کے معاملے میں تمام مسلمانوں کی وحدت کو ممکن نہیں بنا سکتے تو کم سے کم ایک علاقے یا ملک کے لوگ تو اپنے شعائر میں اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ ان کے لیے یہ صورتِ حال قابلِ قبول نہیں ہونی چاہیے کہ ایک ملک کے لوگ دو حصوں میں بٹے رہیں۔ ایک حصہ روزے سے ہو اور دوسرا روزے کے بغیر۔ لیکن مخلص نوجوانوں کی اس اجتہادی غلطی کا علاج گولی نہیں ہے‘ بلکہ صبر وتحمل کے ساتھ انہیں بات سمجھانا ہے۔

☆ **منکر کا ظاہری ارتکاب**: دوسری شرط یہ ہے کہ منکر کا ارتکاب ظاہری ہو‘ خفیہ نہ ہو‘ یعنی اس منکر کا ارتکاب ظاہر اور دیکھا جا سکنے والا ہو۔ اگر کوئی شخص اسے لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھتا ہے اور اپنے بند دروازے کے اندر ایسا کرتا ہے تو کسی کے لیے اس کے بارے میں نگرانی کے آلات یا خفیہ تصویری کیمروں یا منکر کے ارتکاب کے شک میں اس کے گھر پر چھاپہ مارنا جائز نہیں ہے۔

یہ وہ نکات ہیں جن کی نشان دہی حدیث کے یہ الفاظ کرتے ہیں: ((مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ ......)) ”جو تم میں سے کسی منکر کو دیکھے وہ اسے بدل دے......“ یعنی روکنے کا حکم منکر کے دکھائی دینے اور مشاہدے میں آ سکنے سے مشروط ہے۔ منکر کے بارے میں کسی سے صرف سن لینے کی شرط نہیں لگائی گئی۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ اسلام اس شخص پر سزا کو نافذ نہیں کرتا جو منکر کا ارتکاب چھپ چھپا کر کرے‘ علی الاعلان نہ کرے۔ اسلام اس کا حساب آخرت میں اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ دنیا میں اس کے اوپر کسی کو کوئی اختیار نہیں‘ سوائے یہ کہ وہ خود اپنے جرم کو ننگا کر دے اور اپنا پردہ ظاہر کر دے۔ عذابِ الٰہی کے بارے میں تو یہاں تک ہے کہ جس شخص کے جرم پر اللہ کی طرف سے پردہ پڑا ہوا ہے اور وہ خود بھی اسے ظاہر نہیں کرتا تو ایسے مجرمین کی سزا میں تخفیف کر دی جائے گی۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے: ”میری پوری امت کو معاف کیا جا سکتا ہے مگر معصیت کا علی الاعلان ارتکاب کرنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔“

یہی وجہ ہے کہ خفیہ منکرات کے بارے میں کسی کو کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں

ہے۔ خفیہ منکرات میں سرفہرست قلبی معصیات یعنی ریاکاری‘ نفاق‘ کبر‘ حسد‘ بخل اور غرور وغیرہ ہیں۔ اگرچہ دین نے ان گناہوں کو کبیرہ قرار دیا ہے‘ لیکن یہ اُس وقت کبیرہ بنتے ہیں جب ظاہری عمل میں ڈھل کر سامنے آ جائیں‘ اور ایسا اس لیے ہے کہ ہمیں ظاہری صورتِ حال پر رائے دینے اور خفیہ صورتِ حال کو اللہ پر چھوڑ دینے کا حکم ہے۔

حضرت عمرؓ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اس سلسلے کے عمدہ واقعات میں سے ہے۔ یہ واقعہ امام غزالیؒ نے ’احیاء علوم الدین‘ میں ’الامر بالمعروف والنھی عن المنکر‘ کے تحت بیان کیا ہے:

’’حضرت عمرؓ دیوار پھلانگ کر ایک آدمی کے گھر میں چلے گئے اور اس آدمی کو ناپسندیدہ حالت میں دیکھا تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کی۔ آدمی نے کہا: امیر المومنین! اگر میں نے ایک پہلو سے اللہ کی نافرمانی کی ہے‘ تو آپ نے تین پہلوؤں سے نافرمانی کی ہے۔ امیر المومنینؓ نے پوچھا: وہ کیسے؟ آدمی نے کہا: اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ (الحجرات:۱۲) تجسس نہ کرو‘ جب کہ آپؓ نے تجسس کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا﴾ (البقرۃ:۱۸۹) گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو‘ جب کہ آپ دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا﴾ (النور:۲۷) اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو‘ جب کہ آپ نے سلام نہیں کیا۔ آدمی کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے آدمی کو توبہ کرنے کی شرط پر چھوڑ دیا۔‘‘

(احیاء علوم الدین‘ ج ۷‘ ص ۱۲۱۸‘ طبع الشعب‘ القاھرہ)

☆ **منکر کو روکنے کی طاقت:** تیسری شرط یہ ہے کہ منکر کو روکنے کی بالفعل طاقت رکھتا ہو۔ گویا منکر کو روکنے والا ذاتی طور پر یا اپنے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ مل کر بالفعل یہ طاقت رکھتا ہو کہ منکر کو قوت سے روک سکے۔ اس کے پاس مادّی اور معنوی طور پر یہ قوت ہو کہ وہ آسانی کے ساتھ منکر کا ازالہ کر سکے۔ یہ شرط بھی زیر بحث حدیث کے ان الفاظ سے ماخوذ ہے: فَمَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ جو طاقت نہ رکھتا ہو وہ زبان سے روکے۔ یعنی جو شخص برائی کو اپنے ہاتھ کی قوت سے نہیں روک سکتا وہ اس کام کو ان لوگوں کے لیے چھوڑ دے جو اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ وہ خود صرف زبان و بیان پر ہی اکتفا کرے اور وہ بھی اگر اس کے بس میں ہو تو۔

یہ کام غالباً ہر صاحبِ اختیار اپنے دائرۂ اختیار میں کر سکتا ہے۔ خاوند اپنی بیوی‘ باپ اپنی

اولاد‘ سرپرست اپنے زیر سرپرستی افراد‘ کسی ادارے کا سربراہ اپنے ادارے کے اندر اور امورِ حکومت کے ذمہ داران اپنی ذمہ داری اور اتھارٹی کے حدود اور اپنے اختیار کے حدود میں رہتے ہوئے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بعض اشیاء و امور کا فیصلہ ذمہ دارانِ حکومت کے بس میں بھی نہیں ہوتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا معاملہ اس مسئلے میں بہت واضح مثال ہے‘ یعنی وہ موروثی نظام سے ہٹ کر عنانِ حکومت کو مسلمانوں کی شوریٰ میں نہیں لوٹا سکے۔

ہم نے اس شرط کے آغاز میں مادّی و معنوی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ خاوند کا اپنی بیوی پر یا باپ کا اپنی اولاد پر اختیار اس لیے نہیں ہے کہ وہ مادّی قوت کا مالک ہوتا ہے‘ بلکہ اس بنا پر ہے کہ اس کا ایک احترام اور ہیبت ہوتی ہے جو اس کی بات کو منواتی اور اس کے حکم کو نافذ کرتی ہے۔

☆ **فتنہ وفساد کا خدشہ:** چوتھی شرط یہ ہے کہ کسی بڑی برائی کے پیدا ہونے کا خدشہ نہ ہو۔ گویا منکر کو طاقت سے روکنے یا اسے ختم کرنے کے نتیجے میں کوئی بڑی برائی پیدا ہو جانے کا ڈر نہ ہو‘ کہ یہ فعل ایسے فساد کا باعث بن جائے جس میں بے گناہوں کا خون بہہ جائے‘ حرمتیں پامال کی جائیں‘ مال و دولت لوٹ لی جائے اور آخری نتیجہ یہ نکلے کہ برائی اپنے قدم مزید مضبوط کر لے اور ظالم و متکبر زمین میں ظلم وفساد کا بازار گرم کر دیں۔

علماء نے اسی بنا پر اس منکر پر خاموشی کو جائز ٹھہرایا ہے جس کو روکنے کے نتیجے میں اس سے بھی بڑی برائی پیدا ہونے کا ڈر ہو۔ یہاں کم تر ضرر کے ارتکاب اور کم تر شر کے اختیار کا اصول نافذ ہوتا ہے۔ اس بارے میں صحیح حدیث بھی موجود ہے: نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ’’اگر تمہاری قوم سے پہنچنے والے شر کا مجھے خوف نہ ہوتو میں کعبہ کو ابراہیمی بنیادوں پر استوار کر دوں۔‘‘

قرآنِ مجید میں بھی اس نکتے کی تائید میں واقعہ موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنے رب سے وعدے کے مطابق چالیس راتیں گزارنے کے لیے قوم سے دور چلے گئے تو ان کی غیر موجودگی میں یہودی جادوگر سامری نے قوم کو سنہری بچھڑے کے فتنے میں مبتلا کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شریکِ نبوت بھائی حضرت ہارون علیہ السلام نے قوم کو وعظ و نصیحت کی‘ مگر وہ باز نہ آئے اور سامری کے پیچھے چل پڑے۔ کہنے لگے:

﴿لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْہِ عٰکِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ﴿۹۱﴾﴾ (طٰہٰ)

’’ہم تو اِسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ ہمارے پاس واپس نہ آ جائے۔‘‘

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام میعاد پوری کر کے واپس آئے اور قوم کو اس بچھڑے کی عبادت جیسی بدترین برائی میں مبتلا دیکھا تو بھائی کو ان کی سستی اور عدم توجہی پر زدوکوب کرنے لگے۔ اُن کی داڑھی پکڑ لی اور شدتِ غضب میں کہا:

﴿قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾﴾ (طٰہٰ)

''موسیٰؑ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارون کی طرف پلٹے اور) بولے: ہارونؑ، تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟ ہارونؑ نے جواب دیا: اے میری ماں کے بیٹے، میری داڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تم آ کر کہو گے: تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔''

اس واقعے میں حضرت ہارون علیہ السلام کے عمل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی میں قوم کی وحدت اور یک جہتی کو محفوظ رکھنا مقدم سمجھا اور خیال کیا کہ بھائی کے آ جانے پر باہمی سوچ بچار کے بعد دیکھیں گے کہ حزم و احتیاط اور حکمت و دانائی کے متقاضی اس خطرناک موقف سے کس طرح نپٹنا ہے۔

یہ چار شرائط ہیں۔ جو شخص بھی برائی کو ہاتھ کی قوت سے یا دوسرے الفاظ میں ناگزیر مادّی قوت سے روکنا چاہتا ہو اُس پر ان شرائط کو پورا کرنا فرض ہے۔

جب منکر کا ارتکاب حکومت کر رہی ہو

منکر کو روکنے کے مسئلے میں ایک مشکل یہ بھی کھڑی ہو جاتی ہے کہ جب صاحبِ قوت اور صاحبِ اختیار، یعنی حکومت ہی برائی کی مرتکب ہو تو پھر افراد اور جماعتیں اس منکر کو کیسے روکیں جس میں حکومت ملوث ہو یا حکومت اس کی پشت پناہی کر رہی ہو؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ افراد اور جماعتیں پہلے اتنی قوت کی مالک بنیں جو برائی کو روک سکے۔ عہدِ حاضر میں تین طاقتوں میں سے ایک کے ذریعے ہی یہ ممکن ہے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:

i- **مسلح افواج:** یہ وہ طاقت ہے جس کا سہارا عہدِ حاضر کے بہت سے ملک لیتے ہیں۔ خصوصاً تیسری دنیا میں اپنے حکم نافذ کرنے، سیاست کا سکہ بٹھانے اور اپنے مخالفین کو آتش و آہن کے ذریعے خاموش کرنے کے لیے اسی قوت سے کام لیتے ہیں۔ ان حکومتوں کے نزدیک مناسب،

محفوظ اور معقول راستہ دلیل و منطق اور بات چیت کا نہیں بلکہ قوت کا ہے۔ یہ قوتیں جس کے ساتھ ہوں گی اس کے لیے قومی دھارے کے رخ کو بدلنا یا روک دینا ممکن ہو گا۔ اس کا مظاہرہ ماضی قریب میں بہت سے ممالک میں کیا گیا اور آئے روز کہیں نہ کہیں ہوتا رہتا ہے۔

ii- **پارلیمنٹ:** مروّجہ جمہوری نظامِ حکومت میں غالب اکثریت رکھنے والی پارلیمنٹ کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ قانون بنا بھی سکتی ہے اور تبدیل بھی کر سکتی ہے۔ خالص حقیقی جمہوری نظام کے تحت یہ اکثریت جس کو بھی حاصل ہو جائے اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ قانون سازی کے بعد اس کو نافذ کر کے ان تمام منکرات کو روک سکتی ہے جو اسے نظر آئیں۔ پھر کسی وزیر، سربراہِ حکومت، یا سربراہِ ریاست کے بس میں نہیں ہوتا کہ وہ پارلیمنٹ کے سامنے نہ کہے۔

iii- **قومی سطح کی فیصلہ کن عوامی قوت:** یہ عوام کی ملکی سطح کی ایسی فیصلہ کن قوت ہوتی ہے جسے اجتماع سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ جب یہ قوت حرکت میں آ جائے تو کسی میں ہمت نہیں ہوتی کہ اس کا سامنا کرے یا اس کا راستہ روکے۔ یہ قوت اپنی تندی اور تیزی میں ٹھاٹھیں مارتے سمندر یا سب کچھ بہالے جانے والے سیلاب کی مانند ہوتی ہے کہ کوئی شے حتیٰ کہ مسلح قوتیں بھی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں۔ یہ مسلح قوتیں بھی تو اسی کا حصہ ہوتی ہیں اور یہ عوام ان قوتوں کے افراد، خاندان، باپ، بیٹے اور بھائی ہی تو ہوتے ہیں۔

جس کے پاس ان تینوں قوتوں میں سے کوئی بھی نہ ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ صبر سے کام لے، دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرے، اور روابط کو بڑھانے پر توجہ دے۔ یہاں تک کہ وہ ان قوتوں میں سے کسی ایک کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ جب تک اسے یہ طاقت حاصل نہیں ہو جاتی وہ اپنی زبان اور قلم، دعوت اور تعلیم، رہنمائی و توجہ اور نصیحت و مشورے کے ذریعے منکر کی روک تھام کا فریضہ ادا کرے، اور اس وقت تک یہ فریضہ ادا کرتا رہے جب تک کہ رائے عامہ کو برائی کے انسداد پر یکسو اور یک زبان نہ کر لے جو برائی کے خاتمے کا مطالبہ کرے۔ پھر وہ صاحبِ ایمان آئندہ نسل کی ایسی تربیت کرے کہ وہ برائی کے انسداد کی اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائے۔ اس نکتے کی طرف حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث میں اشارہ موجود ہے۔ حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سورۃ المائدہ (آیت ۱۰۵) کے بارے میں پوچھا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا

اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے انہیں جواب دیا:

’’تم ایک دوسرے کو اس وقت تک نیکی کی طرف بلاتے اور برائی سے منع کرتے رہو جب تک تم طمع و لالچ کی پیروی‘ خواہشات کا اتباع‘ دنیا ہی کو سب کی ترجیح اور صاحبِ رائے کو اپنی رائے کے فریب میں مبتلا نہ دیکھ لو‘ اُس وقت تم اپنے اوپر ہی توجہ مرکوز رکھو اور عوام کو چھوڑ دو۔ تمہارے بعد ایسے حالات آنے والے ہیں جن میں صبر کرنے والے کی مثال انگارے کو ہتھیلی میں پکڑنے والے شخص کی مانند ہوگی۔ ان حالات میں دین پر عمل کرنے والے کے لیے پچاس آدمیوں جتنا اجر ہے جو تمہارے جیسے عمل کریں‘‘۔ (ترمذیؒ)

یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ ابوداؤدؒ نے بھی اسے ابن مبارکؒ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ‘ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عتبہ بن ابی حکیم سے روایت کیا ہے۔ بعض روایات میں ’’تم ایسے امور دیکھو جن کو روکنے کی طاقت نہ ہو‘‘ کے الفاظ بھی ہیں۔

منکر کے ازالے میں نرمی کی ضرورت

یہاں ایک اور مسئلہ بھی ہے جس کو ہم فراموش نہیں کر سکتے‘ اور وہ یہ ہے کہ منکر کے ازالے میں نرمی‘ اور اس کے مرتکب لوگوں کو معروف کی دعوت دینے کی ضرورت ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ہمیں اس نرمی کی وصیت کر رکھی ہے اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی کہ ’’اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں اس کو پسند کرتا ہے‘ اور یہ نرمی جس معاملے میں بھی آ جائے اسے حسن عطا کر دیتی ہے اور جس معاملے سے نکل جائے اسے بدنما بنا دیتی ہے۔‘‘

اس سلسلے میں بیان کیا گیا ایک واقعہ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں ذکر کیا ہے کہ ایک آدمی مامون الرشید کے پاس آیا تاکہ اسے نیکی اور بدی کے بارے میں وعظ و نصیحت کرے۔ آدمی نے بات شروع کی تو اس کی گفتگو میں شدت آتی گئی اور اس نے مامون کو اے ظالم‘ اے فاجر! کے الفاظ کہہ کر مخاطب کیا۔ مامون بڑا سمجھ دار اور حلیم الطبع تھا۔ اُس نے آدمی کا جواب اسے سزا کی صورت میں نہ دیا جیسا کہ حکمرانوں کا وتیرہ ہوتا ہے‘ بلکہ کہا: کچھ نرمی سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے بہتر شخص کو نبی بنا کر مجھ سے بدتر لوگوں کی طرف بھیجا‘ اور اسے نرمی کا حکم دیا۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو‘ جو دونوں تجھ سے بہتر ہیں‘ فرعون کی طرف مبعوث کیا جو مجھ سے بدتر ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے دونوں پیغمبروں سے کہا:

﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾﴾

’’جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا‘ شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔‘‘

غور کیجیے کہ اس آیت میں حروفِ اُمید ﴿لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے) اس کے باوجود استعمال کیے کہ فرعون کی سرکشی اور باغیانہ روش کا بھی دوسری جگہ تذکرہ کیا ﴿اِنَّهٗ طَغٰى﴾ (اُس نے سرکشی کی)۔ ان حروفِ امید کا یہاں استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ داعی کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اپنے مخاطبین کے بارے میں امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے‘ خواہ وہ کفر و ظلم کے راستے پر ہی چل رہے ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلسل نرمی اور شائستگی کے ساتھ دعوت دے نہ کہ سختی و شدت کے ساتھ لوگوں کو حق کی طرف بلائے۔

جزوی برائیوں کا انسداد مرض کا علاج نہیں

میں یہاں اس بات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو مسلمانوں کی اصلاح کے عمل میں مصروف لوگوں کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے پسماندگی‘ مغربی استعمار‘ آمروں اور سیکولر حکومتوں کے ادوار میں جس ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہوئے ہیں‘ اس تخریب کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ ان اثرات کو ختم کرنے کے لیے جزوی برائیوں کا ازالہ کافی نہیں ہے۔ مثلاً رقص و سرود کی محفلیں‘ عورتوں کا راستوں میں اظہارِ زینت کے ساتھ آنا جانا‘ آڈیو ویڈیو کیسٹوں کی فروخت وغیرہ اگرچہ نامناسب ہیں‘ جائز نہیں ہیں‘ مگر صرف انہی برائیوں کے خاتمے سے معاشرے کی اصلاح ناممکن ہے۔ معاملہ ان سے بھی بڑا اور عظیم ہے‘ جو کامل‘ وسیع تر اور گہری بنیادوں پر تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ ایسی تبدیلی جو افکار و تصورات‘ اَقدار و معیارات‘ اَخلاق و اَعمال‘ آداب و روایات اور قوانین و ادارہ جات سب کا احاطہ کرتی ہو۔ اس سے پہلے مسلسل تعلیم‘ دائمی تربیت اور بہترین نمونوں کے ذریعے لوگوں کا اندر سے تبدیل ہونا ضروری ہے۔ جب لوگ اپنے آپ کو تبدیل کر لیں گے تو اس کے اہل قرار پائیں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مسلمہ قانون کے مطابق اُنہیں تبدیل کر دے‘ یعنی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ﴾ (الرعد:۱۱)

’’حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔‘‘

(تشکر: ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن لاہور)

❀❀❀

قومِ شعیبؑ کی دو بڑی برائیاں:

شرک اور ناپ تول میں کمی

عتیق الرحمٰن صدیقی

﴿وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَالۡمِیۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ (الاعراف)

’’اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو جس کے سوا تمہارا کوئی پروردگار نہیں ہے۔ تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے رہنمائی آ گئی ہے لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو، اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مؤمن ہو۔‘‘

مدین کا محل وقوع

مدین کا علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحرِ احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا۔ قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہراہ بحرِ احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبوع سے ہوتی ہوئی ملک شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں آباد تھیں۔ عرب کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے اس کے آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔[1]

حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت

جلیل القدر پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام کو اہلِ مدین کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا تھا۔ پوری

قوم خدا بیزاری اور معصیت کا شکار تھی۔ ایک طرف وہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان نہ لا کر حقوق اللہ کی خلاف ورزی کر رہے تھے اور دوسری طرف خرید و فروخت میں ناپ تول گھٹا کر لوگوں کے حقوق بھی ضائع کر رہے تھے۔ انہوں نے لوٹ مار کا بازار بھی گرم کر رکھا تھا اور راستوں سے گزرنے والے مسافروں کو بھی دھمکانے اور ڈرانے کا عمل جاری تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو خصوصیت کے ساتھ انہی تین باتوں کی طرف متوجہ کیا۔ ایک یہ کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں، وہی ان کا معبود ہے۔ یہی وہ دعوتِ توحید ہے جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں اور جو تمام عقائد و اعمال کی بنیاد ہے۔ دوسری اہم بات یہ فرمائی کہ ناپ تول میں ڈنڈی نہ مارو اور ٹھیک ٹھیک معاملہ کرو۔ تیسری یہ کہ تم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے اور اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے راستوں میں نہ بیٹھا کرو۔ علامہ قرطبیؒ نے ان کا یہ عمل بھی نقل کیا ہے کہ وہ لوگ عام مسافروں سے ناجائز ٹیکس بھی وصول کیا کرتے تھے۔

حضرت شعیب علیہ السلام: خطیب الانبیاء

حضرت شعیب علیہ السلام فصیح اللسان بھی تھے اور شیریں کلام بھی۔ حسن خطابت میں انہیں ایک امتیازی شان حاصل تھی۔ وعظ و نصیحت کے معجزانہ اندازِ بیان کی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ’’خطیب الانبیاء‘‘ کے لقب سے یاد فرمایا —— حضرت شعیب علیہ السلام کا ملائمت سے بھرپور اور حلاوت و مٹھاس سے مسحور اندازِ رشد و ہدایت بھی ان کی قوم پر کارگر ثابت نہ ہوا اور قوم نے دعوتِ حق پر ذرا بھی کان نہ دھرا۔ الٹا قوم کے سربرآوردہ افراد اپنی شان و شوکت اور طاقت کے نشے میں اتنے بدمست ہوئے کہ انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کو دھمکی دی کہ وہ انہیں اس بستی سے نکال باہر کریں گے۔ قرآن مجید نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لَنُخۡرِجَنَّکَ یٰشُعَیۡبُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَکَ مِنۡ قَرۡیَتِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِیۡ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوۡ کُنَّا کٰرِهِیۡنَ ﴿۸۸﴾﴾ (الاعراف)

’’اُس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے اس سے کہا کہ اے شعیب، ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے، یا تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ شعیب نے جواب دیا: کیا ہمیں زبردستی پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں!‘‘

قوم کے وڈیروں کی سرکشی

قوم کے یہ وڈیرے اپنی سرکشی اور بغاوت پر اتراتے تھے اور اپنے پیغمبرؑ کے مدّمقابل آ کر نہ صرف شیخیاں بگھارتے تھے' بلکہ لوگوں کو یہ کہنے سے بھی نہ کتراتے تھے کہ شعیبؑ کی پیروی کرنے سے وہ برباد ہو جائیں گے اور ان کی خوشحالی غتربود ہو کر رہ جائے گی۔ یہ لیڈرانِ عِظام اپنی قوم کو یقین دلا رہے تھے کہ شعیبؑ جس ایمان داری اور راست بازی کی دعوت دے رہے ہیں اور اخلاق و دیانت کے جن اصولوں کی پابندی کرانے پر تُلے ہوئے ہیں' ان اصولوں پر چلنے سے تباہی کے سوا انہیں کچھ میسر نہیں آئے گا۔ اگر تم لوگ پُرامن بن جاؤ گے تو جو معاشی و سیاسی فوائد تمہیں اپنی جغرافیائی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر تمہاری جو دھونس قائم ہوئی ہے وہ بھی نیست و نابود ہو کر رہ جائے گی۔

اس حوالے سے یاد رکھیں کہ دعوتِ حق کے مخالفین کا ہر دور میں یہ وتیرہ رہا ہے کہ تجارت میں ہیر پھیر ضروری ہے اور جھوٹ اور بے ایمانی کے بغیر تجارت کی بیل منڈھے چڑھ ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ یہ کج رو لوگ لین دین کے پیمانوں میں ہمیشہ ٹیڑھ پن کا شکار رہے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے حق و راستی کے سبق کو قبول نہ کر کے انہوں نے تباہی و بربادی اور ہلاکت مول لی۔ قرآن مجید میں ان کے انجام کا تذکرہ بایں الفاظ کیا گیا ہے:

﴿فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا شُعَیۡبًا کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡہَا ۚۛ اَلَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا شُعَیۡبًا کَانُوۡا ہُمُ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۹۱﴾﴾ (الاعراف)

''مگر ہوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا وہ ایسے ہو گئے گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیبؑ کے جھٹلانے والے ہی آخرکار برباد ہو کر رہے۔''

قرآن حکیم میں ذکرِ شعیب علیہ السلام

قرآن حکیم کی چار سورتوں اعراف' ہود' شعراء اور عنکبوت میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے اور آپ کا اسم گرامی قرآن حکیم میں دس جگہ آیا ہے۔ سورۂ ہُود میں فرمایا:

﴿قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ وَ لَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ وَّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ ﴿۸۴﴾ وَ یٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ

وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۵﴾ بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۬ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ﴿۸۶﴾﴾

''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو' اُس کے سوا تمہارا کوئی پروردگار نہیں ہے۔ اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو' آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا۔ اور برادرانِ قوم! انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مؤمن ہو۔ اور بہرحال میں تمہارے اوپر کوئی نگران نہیں ہوں۔''

سورۃ الشعراء میں حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

﴿اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۷۹﴾ وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِیۡنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ زِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ ﴿۱۸۲﴾ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾﴾

''میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اس کام پر میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' میرا اجر تو تمام جہانوں کے پروردگار کے ذمہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو اور لوگوں کو گھاٹا دینے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ صحیح ترازو سے تولو' اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔''

سورۃ العنکبوت میں فرمایا:

﴿وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ ارۡجُوا الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۳۶﴾﴾

''اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا تو اُس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو' اور روزِ آخر کے امیدوار رہو' اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو۔''

قومِ شعیب کی دو بڑی برائیاں

قرآن مجید کے ان تمام مقامات پر قومِ شعیب کی دو بڑی خرابیوں کا تذکرہ ملتا ہے' ایک شرک اور دوسرا تجارتی معاملات میں بددیانتی۔ حضرت شعیب علیہ السلام ان دو بڑی برائیوں کے

استیصال اور قلع قمع کے لیے مبعوث کیے گئے۔ قرآن نے قومِ شعیب کے طرزِ عمل کو فساد سے تعبیر کیا ہے۔ فساد قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ انسان کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور ربّ العالمین کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اَخلاق ومعاشرت اور تمدن کو ایسے اصول وقوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں' کو فساد کہا جاتا ہے۔ یہی وہ بنیادی فساد ہے جس میں زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔(۲)

شرک کی عفونت

شرک کی عفونت جب کسی قوم کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو ان کے فکری اساسات کو منہدم کر کے رکھ دیتی ہے جو فطرتِ صحیحہ نے اسے ودیعت کر رکھی ہوتی ہیں۔ اس کی کج روی اس انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ اس قوم کے اعمال اور صبح وشام کی سرگرمیاں خواہشاتِ نفسانیہ کی اسیر بن کر رہ جاتی ہیں اور اس کے طور اطوار تعفن آمیز بن جاتے ہیں۔ اخلاق رذالت اور دنائت کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایسے اعمالِ شنیعہ کا صدور ہونے لگتا ہے کہ انسانیت شرمسار ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ تصورِ توحید کی شفافیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ توحید کے مختلف پہلوؤں کے نقوش مرتسم کرنے میں مدتیں گزر جاتی ہیں۔ جب بندگیٔ ربّ کا تصور گہرا ہو جاتا ہے' اس میں اخلاص کی نمود جلوہ کناں ہوتی ہے تو وہ لوگ حق وصداقت' دیانت وامانت اور اخوت وبھائی چارے کی چلتی پھرتی علامت بن جاتے ہیں' وہ نہ تو دوسروں کو گزند پہنچاتے ہیں اور نہ تحریص کا شکار ہو کر دوسروں کے حقوق پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔

ناپ تول میں کمی

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم شرک کی آلودگی میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ جس جرم عظیم کی مرتکب ہو رہی تھی وہ ان کے ناپ تول میں کمی بیشی کا عنصر تھا۔ وہ لینے دینے اور خرید و فروخت کے پیمانوں میں ہیر پھیر کر کے پیسے بٹورنے میں اپنی عیاری اور چالاکی پر نازاں تھے۔ قرآن نے جابجا ان کی اس برائی پر نکیر کی ہے — ناپ تول میں کمی بیشی بھی چوری کے زمرے میں آتی ہے۔ یہ ایک بڑی برائی ہے' اسلام نے اس سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ عام طور پر تاجر اور بیوپاری جو حرص وطمع میں مبتلا ہوتے ہیں' ہوسِ زر کی بدولت یہ دھندا کرتے ہیں

اور یوں خریداروں کو نقصان پہنچانے میں' بزعم خویش وہ اس روش کو تجارتی حیلہ سازی قرار دیتے ہیں' حالانکہ وہ اپنے دین وایمان کا سودا کر رہے ہوتے ہیں اور جسے وہ نفع خیال کرتے ہیں وہ حقیقت میں نفع نہیں ہوتا۔

میزان میں خلل نہ ڈالو

قانونِ عدل کا اقتضاء تو یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہے وہ اس کو دے دی جائے اور اس میں کسی طور پر بھی خیانت نہ کی جائے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝۷ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝۸ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝۹﴾ (الرحمٰن)

''آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو۔ اور انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔''

میزان کے معنی ترازو کے ہوتے ہیں۔ مفسّرین نے اس آیۂ کریمہ میں میزان سے مراد عدل لیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ نے کائنات کے پورے نظام کو عدل پر قائم کیا ہے۔ اس کائنات میں جو عظیم قوتیں سرگرمِ عمل ہیں اللہ نے سب کے درمیان کمال درجے کا عدل وتوازن قائم کیا ہے۔ ان کی زندگی اسی لیے برقرار ہے کہ ان کے اسبابِ حیات میں پورا پورا عدل وتوازن پایا جاتا ہے۔ اگر ذرا بھی بے اعتدالی رونما ہو تو سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ ایک متوازن کائنات اس امر کی متقاضی ہے کہ نظامِ عدل کو بروئے کار لایا جائے۔ ہر فرد عدل کی نظیر قائم کرے' اپنے اختیارات کو ان تقاضوں کے مطابق کام میں لائے' حق داروں کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرے' کسی کی حق تلفی کر کے فطرتِ کائنات سے بغاوت وسرکشی کا مرتکب نہ ہو۔ اگر کوئی آدمی ڈنڈی مار کر خریدار کے حصے کو ہڑپ کرتا ہے تو وہ دراصل میزانِ عالم میں خلل برپا کرنے کا موجب بنتا ہے' فساد وبگاڑ کی بنیاد رکھتا ہے اور کدورت ومنافرت کو غذا فراہم کرتا ہے۔ قومِ شعیب کا پیشہ تجارت تھا اور وہ اپنی تجارت کے نشوونما وارتقاء کے لیے ناپ تول میں بے ایمانی کو مفید خیال کرتی تھی' لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ اس طرزِ عمل سے خیر وبرکت جاتی رہتی ہے۔

حقوق العباد کی اہمیت

اسلام نے حقوق العباد پر بہت زور دیا ہے' دوسرے کا حق غصب کرنے والوں کی خاصی

گرفت کی ہے اور مختلف پابندیاں عائد کی ہیں۔ یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ہاں اگر بہترین طریقہ سے اس کے مال کی محافظت کی جائے تو یہ احسن طرزِ عمل ہے۔ اسی مناسبت سے ناپ تول میں انصاف سے کام لینے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ۚ وَاِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰى ۚ وَبِعَهۡدِ اللّٰهِ اَوۡفُوۡا ؕ﴾ (آیت ۱۵۲)

''اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔ اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ اِذَا كِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ﴿۳۵﴾﴾

''پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔''

اسلامی حکومت کے فرائض میں بھی یہ شامل ہے کہ وہ منڈیوں اور بازاروں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کرے اور تطفیف کو بزور بند کرے تاکہ تجارتی امور اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی حق تلفیوں اور بے ایمانیوں کا سدباب ہو سکے۔ انجام کار کے لحاظ سے بھی یہ طرزِ عمل مفید اور مستحسن ہے' جبکہ باہم اعتماد کو اس طرح نہ صرف فروغ ملتا ہے بلکہ یہ خوشحالی کا باعث بھی بنتا ہے۔

تطفیف کی اصطلاح

سورۃ المطفّفین میں ارشاد ہوا:

﴿وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ﴿۱﴾ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ﴿۲﴾ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ ﴿۳﴾ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴﴾ لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۵﴾ يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶﴾﴾

''تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ اور تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھٹا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں

سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جبکہ سب لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے کمی کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دراصل ایسی حرکت کرنے والا ناپ یا تول کر چیز دیتے ہوئے زیادہ مقدار نہیں اڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر خریدار کے حصے میں سے تھوڑا تھوڑا ہضم کر رہا ہوتا ہے۔ معاشرے کی خرابیوں میں سے ایک قبیح اور مذموم حرکت یہ ہے کہ اس کے تاجر پیشہ افراد' سوداگر اور بیوپاری اپنے معاملات میں راست بازی اختیار کرنے کے بجائے بددیانتی اور خیانت کو اپنا معمول بنالیں۔ خوفِ خدا اور آخرت کی بازپرس سے عاری لوگ ہی یہ مذموم اور کریہہ انداز اپنانے کی جرأت و جسارت کرتے ہیں۔ قومِ شعیبؑ بھی اسی مرض میں بری طرح مبتلا تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے پے در پے نصیحتیں کرنے اور انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی' مگر قوم نے اپنے پیغمبر کی دعوت پر کان نہ دھرا اور بالآخر بھیانک عذاب سے دوچار ہوئی۔

ناپ تول میں کمی کی مذمت: احادیثِ نبویہؐ کی روشنی میں

● حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پانچ برائیاں ایسی ہیں کہ اگر تم ان میں مبتلا ہوئے اور یہ تمہارے اندر گھس آئیں تو بہت برا ہوگا۔ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ یہ پانچوں برائیاں تمہارے اندر پیدا ہوں' ان برائیوں میں ایک برائی یہ ہے:

((وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلَّا أُخِذُوْا بِالسِّنِيْنَ وَشِدَّةِ الْمَئُوْنَةِ وَجَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ)) (۳)

''ناپ تول میں کمی کرنا۔ اگر یہ برائی کسی قوم میں پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر قحط اور خشک سالی اور ظالم حکمران مسلط کر دیتا ہے۔''

● حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے بیان کیا کہ لوگ مجھے خرید و فروخت میں دھوکہ دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ)) (۴) ''جب تو خرید و فروخت کرے تو کہہ دے کہ کوئی دھوکہ فریب نہیں!'' اس کے بعد وہ شخص جب بھی خرید و فروخت کرتا تو یہی کہا کرتا کہ کوئی دھوکہ فریب نہیں!

● احسن طرزِ عمل یہ ہے کہ ہر معاملے میں نرمی' سہولت اور محبت و ملائمت سے کام لیا

جائے اور ذرا سے نفع ونقصان پر مار دھاڑ پر اتر آنے کا طرزِ عمل نہ اختیار کیا جائے۔ محمد بن منکدر رحمہ اللہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَاِذَا اشْتَرٰى وَاِذَا اقْتَضٰى))(۵)

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو بیچتے وقت' خریدتے وقت اور قرض وصول کرتے وقت نرمی کرتا ہے۔''

● ناپ تول کے حوالے سے مشہور تابعی سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کا قول ملاحظہ ہو:

اِذَا جِئْتَ اَرْضًا يُوفُوْنَ الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ فَاَطِلِ الْمُقَامَ بِهَا وَاِذَا جِئْتَ اَرْضًا يُنَقِّصُوْنَ الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ فَاَقْلِلِ الْمُقَامَ بِهَا(۶)

''جب تو ایسے ملک میں آئے جہاں کے لوگ پورا ناپتے اور تولتے ہوں تو وہاں زیادہ سے زیادہ قیام کر اور جب ایسے ملک میں آئے جہاں کے لوگ ناپ تول میں کمی کرتے ہوں تو وہاں کم سے کم قیام کر۔''

یاد رہے کہ جب کسی ملک میں لوگ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں' ان کے لینے اور دینے کے پیمانے یکساں نہیں ہوتے' نفع خوری کی عادت میں مبتلا ہو کر دوسروں کو گھاٹا دیتے ہیں اور انہیں اپنی تجوریاں بھرنے کی فکر ہی لاحق ہوتی ہے' وہاں اللہ کا عذاب اُترنے کا خوف ہوتا ہے' ان کی معیشت بھی تنگ ہو جاتی ہے اور ان کا اطمینانِ قلب بھی سلب ہو کر رہ جاتا ہے۔ أعاذنا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ!

حواشی

(۱) سیرتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام مؤلفہ مولانا عبدالرحمٰن۔

(۲) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو' تفہیم القرآن' سورۃ الاعراف' حاشیہ ۴۴۔

(۳) سنن ابن ماجه' كتاب الفتن' باب العقوبات۔

(۴) موطأ مالك' كتاب البيوع' باب جامع البيوع۔

(۵) صحيح البخارى' كتاب البيوع' باب السهولة والسماحة فى الشراء والبيع......

(۶) موطأ مالك' كتاب البيوع' باب جامع البيوع۔

اسلامی نظامِ خلافت کیا ہے؟

مولانا سید عبدالوہاب شاہ

۳/اپریل ۲۰۱۳ء کو بی بی سی نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں کہا گیا کہ ایک برطانوی ادارے ''برٹش کونسل'' نے ابھی حال ہی میں ایک سروے کیا ہے۔ اس سروے میں اٹھارہ سے انتیس سال کے پانچ ہزار پاکستانی نوجوانوں سے سوالات کیے گئے اور معلومات اکٹھی کی گئیں۔ اس جائزے کے مطابق پاکستانی نوجوانوں کی غالب اکثریت شرعی نظام کی حامی ہے' اور وہ جمہوری نظام کو پاکستان کے لیے درست نظام حکومت نہیں سمجھتے۔ سروے کے مطابق غالب اکثریت نے اسلامی نظام کی حمایت کی جبکہ دوسرے نمبر پر فوجی حکومت اور تیسرے نمبر پر صرف ۱۳ فیصد نوجوانوں نے جمہوریت کی حمایت کی۔ ۹۰ فیصد سے زائد نوجوانوں کا کہنا تھا کہ ملک صحیح سمت میں نہیں جا رہا۔ بی بی سی کی نامہ نگار کے مطابق یہ جائزہ ایک قنوطی نسل کی تصویر کشی کرتا ہے جو پانچ سالہ جمہوری دور سے ذرا بھی خوش نہیں۔ ۹۴ فیصد نوجوانوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ پاکستان غلط سمت میں جا رہا ہے۔ ۲۰۰۷ء میں کیے گئے سروے میں یہ شرح ۵۰ فیصد تھی۔

یہ رپورٹ ایک ایسے وقت میں سامنے آئی ہے جب کہ پاکستان میں الیکشن کا موسم ہے' ایک حکومت اپنے پانچ سال مکمل کر کے دستبردار ہو چکی ہے اور ملکی سسٹم ایک نگران حکومت چلا رہی ہے۔ اس رپورٹ میں جن دو نظاموں سے بحث کی گئی ہے' یعنی جمہوری نظام اور اسلامی نظام' ہمارا مقصد ان میں سے دوسرے نظام یعنی اسلامی نظام کے بارے میں مختصر سی بحث کرنا ہے' تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ اسلامی نظام کی آسان فہم اصطلاح جو آج کل ہمارے ہاں بولی جاتی ہے اس کے لیے اصل اصطلاح کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

اسلامی نظامِ حیات میں حکومت اور ریاست کو تین اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے:

۱۔ امامت' ۲۔ امارت' ۳۔ خلافت۔ قرآن وسنت میں یہ تینوں اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔

امارت

امارت کا لفظ ''أ م ر'' کے مادّے سے بنا ہے' جس میں حکم والا معنی پایا جاتا ہے۔ اسی سے امیر ہے' یعنی حکم دینے والا۔ امارت وہ منصب ہے جس میں آدمی صاحبِ حکم بن جاتا ہے۔

امامت

امامت کا لفظ ''أ م م'' کے مادے سے بنا ہے' جس میں آگے ہونا' پیشوا ہونا اور قیادت کرنے والا معنی پایا جاتا ہے۔ اسی سے امام ہے یعنی جس کی اقتدا کی جائے۔ امامت وہ منصب ہے جس میں آدمی لوگوں کی قیادت کرتا ہے اور لوگ اس کی اقتدا کرتے ہیں۔

شرعی تعریف: سید شریف جرجانی ؒ فرماتے ہیں: امام وہ ہے جسے دینی اور دُنیوی دونوں امور میں عمومی حکمرانی حاصل ہو۔ امام ماوردی ؒ فرماتے ہیں: امامت دین کی حفاظت کرنے اور اس کے ذریعہ دُنیوی امور کی تدبیر اور نظم ونسق کرنے میں نبوت کی نیابت ہے۔

علامہ تفتازانی ؒ فرماتے ہیں: امامت دینی ودُنیوی معاملات میں نبی اکرم ﷺ کی اور فرع میں آپ ﷺ کے احکام کی جانشینی اختیار کرتے ہوئے عمومی اختیار واقتدار ہے۔

یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے: ﴿قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ (البقرۃ:۱۲۴) ''اللہ تعالیٰ نے (حضرت ابراہیم علیہ السلام سے) فرمایا: میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا۔''

خلافت

یہ لفظ ''خ ل ف'' کے مادے سے بنا ہے' جس میں قائم مقام اور جانشین ہونے والا معنی پایا جاتا ہے۔ اسی سے خلیفہ ہے۔ خلیفہ وہ شخص ہے جو اپنے سے پہلے آدمی کے پیچھے آئے' یعنی اس کا جانشین ہو۔ المنجد میں ہے: الخلیفة: جانشین' قائم مقام' بڑا بادشاہ' جمع خلفاء۔ الخلافة: امامت' قائم مقامی۔

خلاصہ کلام یہ کہ امارت' امامت اور خلافت' ان تینوں کا تقریباً ایک ہی مفہوم ہے۔

شرعی تعریف: خلافت کی شرعی تعریف کرتے ہوئے علامہ نسفی ؒ فرماتے ہیں: نیابة عن الرسول علیه السلام فی اقامة الدین بحیث یجب علی کافة الامم الاتباع ''دین کے قائم کرنے میں رسول اللہ ﷺ کی جانشینی' اس طرح کہ تمام اقوام پر خلیفہ کی اتباع فرض ہے۔''

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں: ''درحقیقت خلافت دین کی حفاظت کرنے اور اس کے

ذریعہ دنیوی امور کی تدبیر اور نظم ونسق کرنے میں صاحبِ شریعت (رسول اللہ ﷺ) کی نیابت اور جانشینی کا نام ہے۔''

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''باید دانست کہ ریاست دریں مقام عبارت است از تربیت بندگانِ الٰہی بر قانونِ معاش ومعاد بطریق امامت وحکومت'' (منصبِ امامت، ص ۳۰) یعنی سیاست سے مراد ہے بندگانِ الٰہی کی اصلاح معاش ومعاد کے قوانین پر امامت وحکومت کے طریق سے تربیت کرنا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الخلافة هي الرياسة العامة في التصدي لاقامة الدين...... الخ (ازالة الخلفاء اول، ص ۱۷) "خلافت عامہ وہ ریاست عامہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے عملاً اقامتِ دین کے لیے حاصل ہوئی ہو"۔ یعنی علوم دینیہ کا احیاء، ارکانِ اسلام کی اقامت، جہاد اور متعلقاتِ جہاد کا قیام، جیسے افواج کی تربیت، مجاہدین کو وظائف دینا، مالِ غنیمت کی تقسیم، نظامِ قضا کا قیام، حدود کا اجراء، مظالم کو دور کرنا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔

آگے پھر اس تعریف میں ذکر کردہ قیود کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ریاستِ عامہ کے لفظ سے وہ لوگ نکل گئے جن کو ریاستِ عامہ حاصل نہیں، مثلاً علماء، قاضی، فوجی افسران، خطباء وواعظین۔ اقامتِ دین کی قید سے ظالم اور جابر بادشاہ خارج ہو گئے جو ملک پر غلبہ اور تسلط حاصل کر کے غیر شرعی طریقہ سے خراج وصول کرتے ہیں۔ بالتصدی کی قید سے وہ شخص خارج ہو جاتا ہے جو اقامتِ دین کا اہل ہو، لیکن بالفعل یعنی عملاً ان امور کو سرانجام نہ دے اور نہ اس کو غلبہ حاصل ہو، جیسے پوشیدہ اور غیر غالب امام مثلاً اہلِ تشیّع کے نزدیک امام مہدی۔ نیابت کی قید سے انبیاء علیہم السلام خارج ہو گئے، کیونکہ وہ نبی تھے نہ کہ نائب نبی۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ''خلافت کے معنی جانشینی ہے اور عرفِ شرع میں اس سے مراد ان امور کو عملاً قائم کرنا ہے جن کے قائم کرنے کے لیے پیغمبر مبعوث ہوئے۔ خلافت رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا نام ہے، کیونکہ خلیفہ امت میں رسول اللہ ﷺ کا جانشین ہوتا ہے۔''

خلافت کا مقصد کیا ہے؟

موجودہ دور میں سیاسی پارٹیاں اپنا اپنا ایک منشور بناتی ہیں اور پھر اس منشور کو عوام کے سامنے رکھ کر اسی منشور کی بنیاد پر الیکشن میں حصہ لیتی ہیں، پھر کوئی ایک پارٹی جیت کر ان مقاصد

کے حصول کے لیے کام کرتی ہے جن کے لیے اس نے حکومت حاصل کی۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے بھی کچھ مقاصد ہیں۔ اقتدار وحکومت بذاتِ خود مقصود نہیں، لیکن چونکہ یہ مقاصد غلبہ اور اقتدار کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے، لہٰذا اسلام نے ان مقاصد کے حصول کے لیے غلبہ اور اقتدار حاصل کرنا لازمی قرار دیا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقاصد خلافت کیا ہیں؟ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اس کا خلاصہ یوں بیان فرماتے ہیں:

> ''خلافت کا معنی جانشینی ہے اور عرفِ شریعت میں ان امور کے قائم کرنے کی کوشش کرنا جن کے قائم کرنے کے لیے پیغمبر مبعوث ہوئے۔ یعنی پیغمبر اسلام ﷺ جو احکاماتِ الٰہیہ لائے اور ان کو عملاً نافذ بھی کیا، خواہ ان کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے، ان کو عملاً نافذ کرنا یہی نظامِ خلافت کا مقصد ہے۔''

نہایت ہی اختصار کے ساتھ مقاصد خلافت کو اگر بیان کیا جائے تو وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱) اقامتِ دین: سورۃ الحج آیت ۴۱ کی تفسیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آیت کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو اس بات سے موصوف کیا ہے کہ اگر انہیں زمین میں طاقت واقتدار دیا جائے تو وہ چار امور یعنی نماز، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قائم کریں گے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خلفائے راشدین کی نصرت کی اور اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، حتیٰ کہ انہیں عرب وعجم پر مسلّط کیا اور ان کے زمانے میں مسلمانوں کو کفار کی زمین، گھروں اور ان کے مال ودولت کا وارث بنایا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: خلافتِ شرعی اس تمکین فی الارض کا نام ہے جو اقامت دین کے ساتھ ہو، یعنی ان کو اگر تمکین فی الارض ہوگی تو وہ ضرور اقامت دین کریں گے اور خلافت راشدہ کے یہی معنی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ خلافت کا مقصد اقامت دین ہے، یعنی دین کے ہر شعبے کو قائم کرنا۔

۲) قوانینِ شریعت کا نفاذ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انسان اللہ کی شریعت قائم کرنے، توحید کے دلائل قائم کرنے اور مخلوق میں حکومت کرنے میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ یعنی یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جو خلیفہ سرانجام دے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ خطبہ میں فرمایا: حاکم اپنی رعیت کی ان امور میں خبرگیری کرے گا جن کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ یعنی اللہ نے جس چیز کا حکم دیا حاکم ان چیزوں کا حکم رعیت کو کرے گا اور اللہ نے جن چیزوں سے منع کیا ان سے منع کرے گا۔ امام بغوی رحمہ اللہ اس آیت

کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انسان اللہ کا خلیفہ ہے اُس کے احکام اور فیصلوں کو نافذ کرنے میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقاصدِ خلافت میں سے ایک مقصد قوانینِ شریعت کا نفاذ بھی ہے۔

۳) غلبۂ اسلام: محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور دین اسلام قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ دین اسلام کے آنے کے بعد تمام مذاہب منسوخ ہو گئے‘ اب صرف اسلام ہی قیامت تک رہے گا‘ لہٰذا اب تمام نظاموں‘ مذاہب اور نظریات کو ختم کر کے اسلامی نظام کا نفاذ ضروری ہے اور یہی حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد بھی ہے‘ جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ: ۳۳‘ الفتح: ۲۸‘ الصف: ۹)

’’وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔‘‘

امام اہلِ سنّت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی ؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اس آیت میں اگر سمجھنے کی کوئی چیز ہے تو وہ یہ ہے کہ غالب کرنے سے کیا مراد ہے؟ غلبہ دو قسم کا ہوتا ہے: ایک دلیل میں غالب کرنا اور دوسرا تیغ وسناں کے ذریعہ غالب کرنا۔ ہم کہتے ہیں یہاں دونوں غلبے مراد ہیں۔

۴) اُمت کی سیاست: یعنی امت کے دینی و دنیوی امور کا نظم و نسق بھی مقاصدِ خلافت میں شامل ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ ، وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ ، وَسَتَكُوْنُ خُلَفَاءُ تَكْثُرُ ......الخ)) (متفق علیہ)

’’بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کرتے تھے۔ جب بھی ایک نبی کا انتقال ہوتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا‘ اور میرے بعد کوئی نبی نہیں‘ البتہ (میرے بعد) بہت سے خلفاء ہوں گے......‘‘

حضور ﷺ نے گورنر یمن عمرو بن حزم انصاری ؓ کو جو خط لکھا اس میں بھی ریاست سے متعلق اہم امور اور حاکم کی تمام ذمہ داریوں کو بیان فرمایا۔ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر‘ قرآنی تعلیمات کی اشاعت‘ عدل وانصاف‘ عبادات اور ارکانِ اسلام کا قیام۔

۵) اُمت کی اجتماعیت: مقاصدِ خلافت میں سے ایک مقصد امت کا اتحاد اور اجتماعیت بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے خلیفہ بننے کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا جس میں خلیفہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

قد استخلف اللّٰہ علیکم خلیفۃ لیجمع بہ الفتکم ویقیم بہ کلمتکم

’’اللہ نے تم پر خلیفہ بنایا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تمہارا اتحاد برقرار رہے اور تمہارا کلمہ (مرکزیت) قائم رہے۔‘‘

۶) نظامِ عبادت کا قیام: انسان کی تخلیق کا اہم مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے‘ اس لیے عبادات کے نظام کی تشکیل بھی مقاصدِ خلافت میں سے ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت ۷۳ کی تفسیر میں امام قرطبی ؒ فرماتے ہیں: یعنی ہم نے انہیں سردار (حکمران) بنایا ہے کہ اچھے کاموں اور فرماں برادری والے اعمال میں ان کی پیروی کی جاتی ہے۔

۷) نظامِ جہاد کا قیام: حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ امام (خلیفہ) اس لیے بنایا جاتا ہے تاکہ وہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرے‘ صدقات وصول کرے‘ حدود قائم کرے‘ احکام کا نفاذ کرے‘ دشمنوں سے جہاد کرے۔

۸) عدالتی نظام: عوام کو بروقت اور مفت عدل وانصاف فراہم کرنا خلافت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے تاکہ وہ امن وامان کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (ص: ۲۶)

’’اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے‘ پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔‘‘

خلیفہ اور بادشاہ میں فرق: حضرت عمر بن خطاب ؓ نے حضرت طلحہؓ‘ حضرت زبیرؓ‘ حضرت کعب اور حضرت سلمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے پوچھا کہ خلیفہ اور بادشاہ میں کیا فرق ہے؟ طلحہ اور زبیر نے کہا ہمیں نہیں معلوم۔ پھر سلمان نے فرمایا: خلیفہ وہ ہے جو لوگوں میں عدل کرے اور برابر تقسیم کرے اور اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرے۔

حضرت شاہ صاحب مقاصدِ خلافت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’جب رسول اللہ ﷺ تمام مخلوق کے لیے مبعوث ہوئے تو مخلوق کے ساتھ معاملات وتصرفات فرمائے اور ان امور کے لیے نائبین مقرر کیے۔ ان معاملات میں غور کرنے

سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد اقامتِ دین ہے اور باقی تمام امور اس کے تحت ہیں۔"

اصولِ خلافت

جس طرح ہر نظام کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں اسی طرح نظامِ خلافت کے بھی چار بنیادی اصول ہیں:

۱) حاکمیت صرف اللہ کے لیے:

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ﴾ (طٰہٰ : ۱۱۴)

"وہ بادشاہ برحق بلند تر ہے۔"

﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۱۲﴾ (غافر)

"پس حکم اللہ ہی کے لیے ہے جو بزرگ و برتر ہے۔"

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ﴾ (یوسف: ۴۰)

"حکومت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہیں۔"

﴿وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۲۶﴾ (الکھف)

"اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۸﴾ (التین)

"کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟"

۲) قانونِ شریعت: کسی بھی ریاست کے نظام میں اس کے قانون کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جس پر حکومت کی تشکیل اور ترقی ہوتی ہے۔ دنیا کے ہر قانون کی کوئی نہ کوئی بنیاد بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام کی بنیاد ذاتِ باری تعالیٰ ہے، وہاں سے حکم جاری ہوتا ہے، خلفاء اس کو زمین پر نافذ کرتے ہیں۔ اسی کو قانون شریعت کہتے ہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ......﴾ (النساء : ۵۹)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ اور اُس کے رسول کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی، پھر اگر کسی چیز میں تمہارے مابین اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دو......"

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (المائدۃ: ۴۸)

"پس آپ ان کے درمیان اس (قرآن) کے ساتھ فیصلہ کریں جو اللہ نے نازل کیا۔"

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۴۴ ...... فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۴۵ ...... فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۴۷﴾ (المائدۃ)

"اور جو نہ فیصلہ کریں اس کے ساتھ جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی تو کافر ہیں...... وہی تو ظالم ہیں...... وہی تو فاسق ہیں۔"

۳) شورائیت: نظامِ خلافت کی بنیاد شورائیت پر ہوتی ہے۔ شورائیت کا مطلب ہے کسی معاملے میں ماہرینِ فن کی رائے لینا، اور امیر کا قرآن وسنت کی روشنی میں ان آراء میں سے بہتر اور مفید رائے پر (کثرت اور قلت نہیں بلکہ) قوتِ دلیل کا اعتبار کرتے ہوئے اور اللہ پر توکل اور اعتماد کرتے ہوئے فیصلہ کرنا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ﴾ (آل عمران: ۱۵۹)

"اور ان سے مشورہ لیجیے کام میں۔ پھر جب آپ قصد کر چکیں اس کام کا تو پھر بھروسہ کریں اللہ پر۔"

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠﴾ (الشوریٰ: ۳۸)

"اور کام کرتے ہیں آپس کے مشورہ سے۔"

شورائیت میں امیر مشورہ لیتا ہے اور پھر فیصلہ خود کرتا ہے، جبکہ جمہوریت میں ووٹ ہی فیصلہ ہوتا ہے۔ شورائیت میں قلت اور کثرت کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ قوتِ دلیل کو دیکھا جاتا ہے، جبکہ جمہوریت میں قلت اور کثرت کو دیکھا جاتا ہے۔ یعنی گھوڑے، گدھے اور انسان سب برابر ہوتے ہیں۔ اسی لیے علامہ محمد اقبال مرحوم نے فرمایا تھا:

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ (الانعام:۱۱۶)

"اگر آپ اہلِ زمین کی اکثریت کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے۔"

۴) وحدتِ خلیفہ: نظامِ خلافت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ پوری دنیا میں ایک ہی اسلامی حکومت اور ایک ہی خلیفہ ہو۔ یہ جمہورِ اہلِ سنّت والجماعۃ کا مسلک ہے۔

حضرت ابوسعید الخدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دو آدمیوں کی خلافت کے لیے (بیک وقت) بیعت کی جائے تو ان میں سے جس کی آخر میں بیعت کی گئی ہے اسے قتل کردو۔''

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد انصار نے دو امیر (ایک انصاری اور ایک مہاجر) منتخب کرنے کا مشورہ دیا' لیکن کبارِ صحابہؓ نے اسے رد کر دیا۔

فرضیتِ خلافت

مسلمانوں کی دنیا وآخرت کی کامیابی اسلامی نظام خلافت کے ساتھ وابستہ ہے اور حضور ﷺ کی بعثت کے مقصد (اظہارِ دین) کا حصول بھی خلافت ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اقامتِ خلافت کو فرض قرار دیا تاکہ ہر دور میں خلافت کے ذریعہ مقصدِ رسالت (اظہارِ دین) حاصل کیا جاتا رہے۔

۱) ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ (البقرة : ۳۰)

امام قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

هذه الاية اصل فى نصب امامٍ وخليفة يُسمع لهٗ ويُطاع لتجمع به الكلمة وتُنفذ به احكام الخليفة ولاخلافَ فى وجوب ذٰلك بين امة ولابين الأئمة

''یہ آیت امام وخلیفہ کے تقرر کے بارے میں قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہے' ایسا امام جس کی بات سنی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تاکہ کلمہ (اسلام کی شیرازہ بندی) اس سے مجتمع رہے اور خلیفہ کے احکام نافذ ہوں۔ امت اور ائمہ میں خلیفہ کے تقرر کے واجب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

مندرجہ بالا تفسیر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امام اور خلیفہ کا تقرر واجب ہے اور اس میں فقہائے کرام کا کوئی اختلاف نہیں۔

۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾
(النساء: ۵۹)

''اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی بھی جو تم میں سے صاحبِ حکم ہیں۔''

جمہور کے نزدیک اولی الامر سے مراد حاکم اور امراء ہیں۔ ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے لازمی قرار دیا ہے' تو اولی الامر کی اطاعت تب ہی ممکن ہے کہ اولی الامر کا وجود بھی ہو۔ لہٰذا اطاعت اولی الامر کی فرضیت سے اولی الامر کے تقرر کی فرضیت مقتضائے نص سے ثابت ہوتی ہے۔

۳) قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق فیصلے کرنے کا حکم ہے:

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (المائدة: ۴۸)

﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (المائدة: ۴۹)

﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ﴾ (النساء : ۵۸)

ظاہر بات ہے جب خلیفہ ہی نہیں ہوگا تو پھر احکاماتِ الٰہیہ پر عمل کون کرائے گا؟ لہٰذا یہاں سے بھی قیامِ حکومت اور تقررِ خلیفہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔

۴) اسی طرح سورۃ الانفال کی آیت ۶۰ میں فرمایا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ....الخ﴾

دشمن کے مقابلے میں قوت جمع کرنا اور دشمن کے لیے ترہیب کا سامان کرنا بھی خلیفہ کے بغیر ناممکن ہے۔ جب خلیفہ ہوگا تو وہ اس پر بتمام وکمال عمل کر سکے گا۔

۵) جو آیات ''جہاد'' کو فرض قرار دیتی ہیں وہ اقامت خلافت کو بھی فرض قرار دیتی ہیں' کیونکہ قاعدہ ہے: مقدّمة الواجب واجبة۔

۶) ہر مسلمان پر خلیفہ کی بیعت فرض ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً)) (رواہ مسلم)

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں (کسی خلیفہ کی) بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

اس حدیث میں خلیفہ کی بیعت کو فرض قرار دیا گیا ہے اور خلیفہ کی بیعت اس کے تقرر کے بغیر نہیں ہوسکتی' لہٰذا خلیفہ کا تقرر فرض ہوا۔ مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں ہے:

((مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً))

''جو شخص امام کی اطاعت سے نکل گیا اور جماعت سے جدا ہوگیا تو وہ جاہلیت کی سی موت مرا۔''

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ای علی صفت موتھم من حیث ھم فوضی لا امام لھم

یعنی وہ کفار کی موت کی صفت پر مرا اس حیثیت سے کہ وہ کفار بغیر کسی امیر کے ہیں اور ان کا کوئی امام نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ طَاعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً)) (رواہ احمد)

''جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ کسی کے زیر اطاعت نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

مسند احمد کی ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں:

((مَنْ مَاتَ بِغَيْرِ اِمَامٍ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً))

''جو شخص بغیر امام (خلیفہ کی حکومت) کے مر گیا وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

۷) حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی تدفین سے قبل ہی صحابہ کرام ؓ نے خلیفہ کا تقرر کیا۔ اس حوالے سے حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''صحابہ کرام کی توجہ آنحضرت ﷺ کے دفن سے بھی پہلے خلیفہ کے تعین و تقرر کی طرف مائل ہوئی' لہٰذا اگر صحابہ کرام کو شریعت کی طرف سے خلیفہ مقرر کرنے کی فرضیت معلوم نہ ہوتی تو وہ حضرات ہرگز خلیفہ کے تقرر کو آنحضرت ﷺ کے دفن پر مقدم نہ کرتے۔''

یہ قاعدہ ہے کہ جب صحابہ کرام ؓ سے کوئی قول یا فعل ایسا صادر ہو جس کا ادراک رائے سے ثابت نہ ہو سکے تو وہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ صحابہ کرام کے اس عمل سے فرضیتِ خلافت پر اجماعِ صحابہ بھی منعقد ہو گیا' کسی صحابی نے اس کی نفی نہیں کی۔

صحابہ کرام ؓ کی طرح تمام ائمہ کا بھی اس بات پر اجماع ہے' جسے ملا علی قاری' امام قرطبی' علامہ ابن حزم اور امام الماوردی ؒ نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح علامہ تفتازانی' امام قرطبی' امام ابن تیمیہ' قاضی ابویعلیٰ' امام عبدالقاہر البغدادی' امام علاء الدین' علامہ ابن عابدین' علامہ عبدالشکور السالمی ؒ نے اقامت خلافت کو فرض قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ لکھتے ہیں: مسلمانوں پر قیامت تک خلیفہ کا تقرر واجب (فرض کفایہ) ہے۔

الغرض یہ کہ مسلمانوں پر خلیفہ کا تقرر اور نظامِ خلافت کا قیام فرضِ کفایہ ہے۔ اور اگر کوئی بھی یہ کام نہ کرے تو پھر سب گناہ گار ہوں گے۔

❁❁❁

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ

محمد رشید عمر

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِی الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۠ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾﴾ (الانعام)

''(اے پیغمبر ﷺ! ان لوگوں سے) پوچھو کیا (تم یہ چاہتے ہو کہ) ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ تو ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان؟ اور جبکہ اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا چکا ہے تو کیا ہم اس کے بعد بھی الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹ جائیں؟ اور پھر ہماری مثال اُس شخص کی سی ہو جائے جس کو شیاطین نے بیابان میں نرغے میں لے لیا ہو اور وہ حیران پریشان (پھر رہا) ہو! اُس کے کچھ (جانے پہچانے) دوست اُس کو (اپنے) راستے کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آ جاؤ! (اے پیغمبر ﷺ!) کہہ دو کہ اصل راہنمائی تو اللہ کی راہنمائی ہے۔ اور ہم کو تو یہی حکم ملا ہے کہ ہم اللہ ربّ العالمین کے آگے سرِتسلیم خم کر دیں۔''

فرمانِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ قوم جب اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستی یا قوت کا سہارا ڈھونڈھتی ہے جو اللہ کے مقابلے میں کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتی اور ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد بھی الٹے قدم بھاگنے کی کوشش کرتی ہے تو پھر اس کی مثال اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جسے کسی بیابان کے اندر شیطانوں کے گروہ نے گھیرے میں لے لیا ہو۔ وہاں سے نکلنے کے لیے وہ نظریں اٹھا کر دیکھتا ہے' اسے کچھ جانے پہچانے لوگ نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ جانے پہچانے لوگ بھی' جب وہ دیکھتا ہے کہ انہی شیطانوں کے بھائی بند' ڈاکو اور لٹیرے ہیں تو اس کی پریشانی اور حیرانی اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ پریشانی اور حیرانی کی کیفیت آج قوم کے ہر فرد پر چھائی ہوئی

ہے۔ الیکشن کے دنگل کا بگل بج چکا ہے۔ الیکشن کمیشن نے سو سے زیادہ پارٹیاں رجسٹر کی ہیں جو الیکشن میں حصہ لے رہی ہیں۔ ایک طرف عوام اور دوسری طرف ان جماعتوں کے گماشتے ہیں جو انہیں اپنی طرف بلا رہے ہیں کہ آؤ ہمارے ساتھ' ہم تمہارے مسائل حل کریں گے! تمہارے دکھوں کا علاج ہمارے پاس ہے! جب غور سے ان بلانے والوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو وہی ڈاکو اور لٹیرے ہیں جنھوں نے پہلے کبھی سلام دعا نہ کی تھی۔ یہی تو بے رحم لٹیرے ہیں جن کے ہاتھوں ہماری یہ درگت بنی ہوئی ہے۔

قوم کی اس کیفیت کا سبب یہ ہے کہ صراطِ مستقیم معلوم ہو چکنے کے بعد بھی ہم نے اللہ کے مقابلے میں ایسے نظامِ حکمرانی کا سہارا لیا جس کے دھوکے میں آ کر ہم اللہ تعالیٰ کی رٹ کو چیلنج کر بیٹھے' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اعلیٰ ترین نظامِ حیات دیا تھا جو ہمارے تمام دکھوں کا مداوا تھا۔ اس کو چھوڑ کر ہم نے جمہوریت کو اپنا لیا۔ اب ہمارا نعرہ یہ بن کر رہ گیا ہے: ''ہم جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں''، ''طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں''، ''جمہوری قوتوں کی بالادستی تک ہماری جدّوجُہد جاری رہے گی''، ''پارلیمنٹ سپریم ہے''، ''جمہوریت بہترین انتقام ہے'' وغیرہ۔ ہمارے لیڈرانِ کرام' چاہے وہ خالص سیاسی جماعتوں کے ہوں یا مذہبی سیاسی جماعتوں کے' یہی نعرے بلند کرتے ہیں۔

یہ جمہوریت کیا ہے؟ اکثریت کا حقِ حکمرانی! بقول ابراہیم لنکن ''عوام کی حکومت' عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے''۔ یہ حقِ حکمرانی خود اسلام کی نگاہ میں توجہ طلب ہے کہ حق حکمرانی ہے بھی یا نہیں؟ بہرحال جس اکثریت کے حقِ حکمرانی کی ہم بات کرتے ہیں اس اکثریت کا مقام اللہ کی نگاہ میں کیا ہے' فرمایا:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾﴾ (الانعام)

''(اے پیغمبر ﷺ!) اگر آپ زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کا کہنا مانیں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور وہ محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔''

اکثریت کا کہا ماننے سے دو وجوہات کی بنیاد پر روکا گیا ہے:

۱) اتّباعِ ظن۔ یعنی یہ اندازوں اور خیالی باتوں کی پیروی کرتے ہیں' جبکہ ﴿اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (الحجرات:۱۲) بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ گناہ کی پیروی کرنے

والے ہوسکتے ہیں۔

۲) يَخْرُصُوْنَ۔ اکثریت من گھڑتیاں کرتی ہے‘ قیاس آرائیاں کرتی ہے۔ مزید يَخْرُصُوْنَ کا مطلب یہ بھی ہے کہ یکذبون فیما ینسبونہ الی اللّٰہ‘ یعنی اللہ کے بارے میں جھوٹ منسوب کرتے ہیں۔ ایسے اوصاف کی حامل اکثریت کی اطاعت اللہ کی راہ سے بھٹکا ہی سکتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اکثریت کی بات ماننے سے منع فرمایا ہے تو ہمیں اکثریت کی اطاعت کرکے فلاح کہاں سے میسّر آسکتی ہے؟

اس نظام پر عمل پیرا ہوکر ہم ﴿قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ کے مصداق اللہ کو چھوڑ کر اندھی بہری اکثریت‘ جسے عوام کالانعام بھی کہا جاتا ہے‘ کا سہارا لے رہے ہیں۔ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے‘ جمہوری قوتوں کا جہاد اسی ایک مقصد کے لیے جاری ہے۔ ایک طرف آمریت اور دوسری طرف جمہوریت کی بالادستی۔ عوام کی طاقت......طاقت کا سرچشمہ عوام!

انہی دونوں کی کشمکش نے ۶۵ سال گنوا دیے‘ جبکہ اللہ کی نگاہ میں اگر اکثریت اللہ کی باغی ہے تو اس میں ذرا بھی خیر اور اچھائی نہیں ہے۔ اور اقلیت یا اکیلا حکمران اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے‘ بلکہ اس کی اطاعت ہی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ دین اسلام میں یہ مسئلہ ہے ہی نہیں کہ تم اکثریت کی مانتے ہو یا ایک کی مانتے ہو؟ یہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے فرماں بردار ہوکر تم اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہو یا ان کے نافرمان بن کر ان کے دشمنوں کے دست و بازو بنتے ہو؟ جہاد کا مطلوب و مقصود اکثریت کی بالادستی یا عوام کی طاقت کا غلبہ نہیں‘ بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کی بالادستی اور اللہ کے دین کا غلبہ ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ عوام کی اکثریت کو تو زندگی کی بنیادی ضرورتیں میسر نہیں ہیں اور ہمارے لیڈران کرام ان کو بے وقوف بنا کر ان کے سرمائے اور توانائیوں پر اپنے عیش و عشرت کے محلات تعمیر کرتے ہیں۔ ان کو جمع کرنے اور اپنی بین ان کو سنانے کے لیے کروڑوں روپے ان جلسوں کے انتظام پر خرچ کر دیتے ہیں‘ جس میں ان کا نعرہ یہی ہوتا ہے کہ ہم عوام کی طاقت سے مخالفین کی نیندیں حرام کر دیں گے۔ ہمارا بھروسہ عوام کی طاقت پر ہے! اللہ نے آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ مسائل کے شکار عوام کو انہوں نے اللہ کے مدِّمقابل کھڑا کر دیا ہے۔ نہ خود اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوئے‘ نہ دکھوں کے مارے عوام کو اللہ کی یاد کرائی۔ سارا

زور جمہوریت کی بحالی اور عوام کی آواز کو سربلند کرنے کے لیے لگایا۔ جس ہستی نے یہ ملک دیا‘ یہ وسائل دیے‘ زندگی کے مواقع دیے‘ اُس کے دین کی سربلندی کو یکسر بھول گئے۔

اب کچھ مذہبی عناصر کی طرف سے دھرنے دیے جا رہے ہیں‘ لیکن ان کا مقصد قرآن و سُنّت کی بالادستی نہیں‘ بلکہ ’’جمہوری نظام کو اپنی صحیح صورت میں قائم کرنا ہے‘‘۔ ان دھرنوں کی غرض و غایت یہ بتائی جا رہی ہے کہ آئین کی ۶۲۔۶۳ شقوں کا صحیح نفاذ کرکے بدعنوان لوگوں کا راستہ روکا جائے اور اس طرح عوام کی بالادستی‘ پارلیمان کو سپریم بنانے والے مخلص اور قابل لوگوں کا حصول ممکن ہوسکے تاکہ وہ شیطانی اور باطل نظام کو اچھے طریقے سے نافذ کرسکیں۔ یعنی اگر کوئی خیر باقی رہ گئی ہے تو اس کو ختم کرسکیں۔ ایسے لگ رہا ہے کہ شیطانی شریعت کے اہم ترین شعبہ ’’امر بالمنکر اور نہی عن المعروف‘‘ پر عمل درآمد کے لیے جیسے دیانتدار افراد کی ضرورت تھی وہ جماعتوں اور جمعیتوں کی محنت کے باوجود حاصل نہیں ہوسکے۔ ان کی کوششوں کے باوجود اس باطل نظام میں ایسے بدعنوان اور بدنام لوگ گھس آتے ہیں جن پر عوام اعتماد نہیں کر رہے۔ چنانچہ اب منافقت کے آئین کی شق ۶۲۔۶۳ پر عمل درآمد اور الیکشن کمیشن کی کارکردگی کو مؤثر بنانے پر زور دینے کے لیے بڑی منصوبہ بندی سے شیخِ کبیر کی خدمات حاصل کی گئی ہیں‘ جو عین الیکشن کے دن بھی اپنے کارکنوں کے ساتھ دھرنا دیں گے کہ ووٹ صرف دیانتدار لوگوں کو دیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو بہتر ہے کہ لوگ ووٹ ہی نہ دیں۔

یا اَسفا‘ جمہور کے نام پر اللہ تعالیٰ کی رِٹ کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ اللہ کے عذاب کے کوڑے نہ برسیں تو کیا اس حال میں من و سلویٰ نازل ہوگا؟ پلٹیے‘ اس جمہوریت کے پودے کو درخت بنانے کی بجائے قرآنی ہدایت پر غور کیجیے:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ (الانعام)

’’ہم پیغمبروں کو صرف اس غرض کے لیے بھیجتے ہیں کہ وہ (ایمان والوں کو) خوش خبری سنائیں اور (انکار کرنے والوں اور بدعملوں کو) خبردار کریں۔ پھر جو کوئی ایمان لایا اور اصلاح کرلی تو ایسے لوگوں کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔‘‘

سورۃ الانعام ہی میں آگے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

''(حقیقت میں تو) امن انہی لوگوں کے لیے ہے اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں جو ایمان لائے اور پھر اپنے ایمان میں شرک کی آمیزش نہیں کی۔''

خوف اور غم کا ازالہ اور امن و ہدایت نبی کریم ﷺ کی پیروی اور توحید عملی کے نفاذ میں ہے۔ انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں مکمل رہنمائی کی بنیاد صرف اور صرف توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت ہے۔ اس کے لیے دو کام کرنے کے ہیں۔

۱) قرآن مجید کے حقوق کی ادائیگی' اسی کی تعلیم' اسی کے ذریعے تربیت اور حکمت کے حصول کی کوشش۔ جب یہ نازل ہو رہا تھا تو اس کی آیات کو ماننے سے انکار کیا جا رہا تھا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (الانعام)

''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ کی تکذیب تو نہیں کرتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔''

کہتے تھے:

﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ﴾ (یونس:۱۵)

''اس قرآن کے علاوہ کوئی اور (قرآن) لاؤ یا اسے تبدیل کر دو!''

مزید برآں وہ کہتے تھے:

﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ﴾ (الانعام:۹۱)

''اللہ تعالیٰ نے کسی بندے پر کچھ نازل نہیں کیا۔''

آج بھی اس کتاب سے غافل کرنے کے لیے عالمِ کفر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے اور اس کے لیے پوری صلاحیتیں اور وسائل لگائے جا رہے ہیں۔ جدید ذرائع ابلاغ' موبائل' انٹرنیٹ اور ٹی وی وغیرہ کے سحر نے انسانوں کی نظر بندی کر دی ہے۔ بڑی بڑی جامعاتِ سلفیہ برائے تعلیماتِ اسلامیہ اور بڑے بڑے قاسم العلوم اسلامیہ ''عصرِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے'' اپنے طالب علموں کو کمپیوٹر فراہم کرنے کے لیے حکومتی امداد لینے والوں کی صف میں کھڑے ہیں۔ قرآن و سنت کے پڑھنے والوں کی نظروں پر ایسا پردہ پڑا ہے کہ وہ اس کی ہلاکت خیزیوں کو جاننے کے باوجود بھی اپنے اداروں میں اس زہر کو داخل کر رہے ہیں اور اس حقیقت سے صرفِ نظر کیے ہوئے ہیں:

﴿وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي

الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۰۲)

''اور وہ (اس علم کو) سیکھتے جو ان کے لیے نقصان دہ تھا نہ کہ نفع بخش۔ درانحالیکہ وہ جان چکے تھے کہ جو کوئی اس کو خریدے گا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔''

نقصان دہ چیزوں کو سیکھنے کے لیے اتنے حریص بن رہے ہیں' جبکہ اس جدید ٹیکنالوجی کی مثال تو ایک ایسے گدھے کی سی ہے جس کی لگام دشمن کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسے جدھر چاہے لے جا سکتا ہے۔ اور ہماری مثال اس گدھے کے پیچھے پیچھے چلنے والے کی سی ہے جس کے حصے گدھے کی لید اور دولتیاں ہی آتی ہیں۔ ہمارا اصل کام تو یہ تھا کہ ہم اس جدید ٹیکنالوجی کے موجد ہوتے اور اس کے کنٹرول روموں میں ہم اس کی تاریں ہلانے والے ہوتے' لیکن ہم نے اس ذمہ داری کو نہ خود ادا کیا نہ قوم کو اس کے لیے آمادہ اور آگاہ کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کی خرید کے لیے زرِ کثیر لٹاتے ہیں اور ان کی فرسودہ ٹیکنالوجی کو ماڈرن ہونے کا ذریعہ بناتے ہیں' جبکہ وہ ان کے ذریعے دولتِ دنیا کے ساتھ دولتِ ایمان سے بھی ہمیں محروم کر رہے ہیں ع ''ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!'' —— یہ چیزیں ہماری نگاہوں کا مرکز بن چکی ہیں۔ ہم بخوشی وہ سب کچھ دیکھتے ہیں جو وہ دکھاتے ہیں اور سنتے ہیں جو وہ سناتے ہیں' درانحالیکہ ہماری نگاہوں کا مرکز قرآن مجید ہونا چاہیے تھا' جس کی شان خود قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾﴾ (البروج)

''بلکہ یہ تو قرآن مجید ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے۔''

کاش ہم لوحِ ٹیلی ویژن یا لوحِ انٹرنیٹ کی بجائے لوحِ محفوظ والے قرآن کو دیکھتے! ''الکتاب'' کا یہ حصہ لوحِ محفوظ سے من وعن ہمیں عطا کر دیا گیا ہے۔ اس کی نقل (duplicate) نہیں' بلکہ فی نفسہٖ سینوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ حروف و اسرار ہی نہیں بلکہ اس کی حکمتیں بھی عطا کی گئی ہیں۔ اس کی معلومات اس حیاتِ دنیا اور مابعد لھٰذہ الحیات پر محیط ہیں۔ ہر معاملے میں موقع و محل کے مطابق ہدایات اس کتاب میں دی گئی ہیں۔ زندگی کی سمت متعین کرنے (navigation) کا نقشہ اس میں دیا گیا ہے۔ ہر موڑ کے alerts اس کتاب میں ملتے ہیں۔ انسانیت کے لیے ماضی حال اور مستقبل کی بریکنگ نیوز اس میں رکھ دی گئی ہیں۔ اس لوحِ قرآنی پر نظر جما کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ آپ کو علم ہے کہ نیزہ بازی والے گھڑسوار اگر اپنے

نصب العین پر نظریں نہ جما کر رکھیں یا اپنے کھونٹے کی بجائے کسی دوسرے کھونٹے کو اپنا نصب العین بنا لیں تو آپس میں ٹکرا کر ہلاکت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اس لوحِ قرآنی کے نصب العین کی بجائے کسی اور نصب العین کو اپنا لیں گے تو ہلاکت سے بچ نہیں سکتے۔ دل و نگاہ کو قرآن مجید کی قوتِ تسخیر کے حوالے کرنا ہو گا تاکہ اس کی حکمتوں کے اسرار کھل سکیں اور عقدہ ہائے لاینحل کا حل سمجھ میں آ سکے اور ہم اس کو دنیا کے سامنے بھی پیش کر سکیں۔

۲) دوسری بات اس کلام پاک کے حوالے سے یہ ہے کہ اس کے حلال کو حلال جانیں اور اس کے حرام کو حرام جان کر اسے ترک کر دیں۔ حلال و حرام کا لحاظ کر کے ہی ہم سلطنتِ ربّانی کی رعایا بن سکتے ہیں۔ اور اگر ہم حلال و حرام کی قیود کا لحاظ نہیں رکھتے تو گویا ہم سلطنتِ ربّانی کے باغیوں میں اپنا نام لکھوا رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ

﴿يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (الاعراف)

''وہ (ﷺ) ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کر دیں گے اور ناپاک چیزوں کو حرام کر دیں گے۔''

محمد رسول اللہ ﷺ جب یہ فریضہ انجام دیتے ہوئے حلال و حرام کو واضح فرماتے تو مکہ کے کُفّار و مُشرکین، جو اُس وقت اکثریت میں تھے، آپ کی باتوں سے حلال و حرام کے احکامات کو جھٹلانے کی دلیلیں اخذ کرتے۔ آپ سے بحث و مناظرہ کرتے۔ آپؐ کی باتوں کو ہوا میں اڑانے کے لیے اپنے کارندوں کو استعمال کرتے اور وہ ان کے اشارے پر ملمّع کی ہوئی باتوں کو آپؐ اور اہلِ ایمان کے خلاف محاذ تیار کرنے کے لیے مکہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آن کی آن میں پہنچا دیتے۔ پوری ہوا کا رخ اس طرح بدل دیتے کہ بعض اہلِ ایمان بھی نبی کریم ﷺ کے ان احکامات پر عمل درآمد میں متذبذب نظر آتے کہ سارے لوگ تو اس طرح کر رہے ہیں، ہم ہوا کے خلاف رخ پر کیسے چلیں؟ اس کی واضح مثال سورۃ الانعام میں اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کی حلت کے حکم پر لوگوں کے ردعمل سے واضح ہے۔ کفار کی دلیل یہ تھی کہ جب آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی مارتا ہے اور زندگی دیتا ہے تو اس کے مارے ہوئے کو حلال کیوں نہیں کہتے؟ کیوں اس کو کھانے سے منع کرتے ہو؟ اور اپنے ہاتھوں سے ذبح کیے ہوئے جانور کو کہتے ہو کہ یہ حلال ہے، صرف یہی کھا سکتے ہو! اکثریت اس جھوٹے پروپیگنڈے پر اس طرح عمل پیرا تھی کہ بعض اہلِ ایمان بھی مشکل میں پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ سورۃ الانعام (آیات ۱۱۷ تا ۱۲۱)

میں اہلِ ایمان کے تذبذب کو ختم کرنے کے لیے احکام نازل فرمائے گئے۔ اسی طرح کی جھوٹی دلیل سود کے بارے میں پیش کرتے، یعنی: ﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ ''تجارت بھی تو سود ہی کی مانند ہے!'' ـــــ اس کا مسکت جواب یہ دیا گیا کہ: ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۷۵) ''اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے!''

حلال و حرام پر کاربند رہ کر اچھے اخلاق والے انسان پیدا ہو سکتے ہیں جو ایک پاکیزہ معاشرہ کی بنیادی اکائی بن سکتے ہیں۔ اچھے اخلاق کی موجودگی نہ صرف وجودِ باری تعالیٰ کی دلیل ہے، بلکہ یہی لوگ توحید پر مبنی نظامِ حیات کے نفاذ کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ قرآن و سنت کے امین اور اس کے نفاذ کی ذمہ داری انہی لوگوں کے ہاتھوں سے پوری ہو سکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی ان قوانین کی مخالفت پر اکثریت نے کمر کسی ہوئی تھی۔ آج بھی اکثریت کا سارا زور اسی پر ہے کہ حرام و حلال کے قوانین کو گھڑنے بنانے کا اختیار اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے اور ہدایت خداوندی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ خیر و شر کی تمیز کے پیمانے اپنے ہاتھوں میں لیے جائیں اور گناہ و ثواب کا آسمانی پیمانہ توڑ دیا جائے۔

پھر عرض کروں گا کہ شیطانِ عصرِ حاضر نے اُمتِ مسلمہ کو نسلی و علاقائی تقسیم کے مسائل میں الجھا کر ان کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اس پر مستزاد ذرائع ابلاغ کے جادو کے ذریعے حلال و حرام کے تصور کو مٹانے کی کامیاب کوششوں پر عمل پیرا ہے۔ ایک طرف علماءِ حق کا قتل اور دوسری طرف تعلیمی نصاب میں من مانی تبدیلیاں اسی بڑے ایجنڈے کا حصہ ہے جس کے بارے میں خبردار کر دیا گیا تھا کہ:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾﴾ (الانعام)

''(اے پیغمبر ﷺ!) اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کا کہنا مانو گے تو وہ تمہیں اللہ کے رستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر ظن و تخمین کی اور وہ محض اٹکل کے تیر تُکّے چلاتے ہیں۔''

بقیہ : عرضِ احوال

لالہ ہردیال‘ ایم اے‘ اپنے ایک لیکچر میں کہتے ہیں: ’’جب انگریز ہندو سنگھٹوں سے عہدو پیمان کرنے کے بعد آزاد ہندو ریاست قائم کر دے یا جب ہندو سنگھٹن کی طاقت سے حکومت قائم کرنے کا وقت قریب آئے گا تو ہماری جو پالیسی مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرف ہوگی‘ اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس وقت باہمی سمجھوتے وغیرہ کی ضرورت نہ ہوگی‘ بلکہ ہندو مہاسبھا صرف اپنے فیصلے کا اعلان کرے گی کہ نئی ہندو ریاست میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے فرائض اور حقوق کیا ہوں گے؟ اور ان کی شدھی کی کیا شرط ہوگی؟‘‘ (روزنامہ ’’ملاپ‘‘ لاہور‘ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء بحوالہ ڈاکٹر خالد علوی’’نظریۂ پاکستان‘‘)

اسی طرح ایک اور ہندو لیڈر سوامی ستیہ دیو جی نے سی پی (متوسط ہند) میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ’’ہندو سنگھٹن کا کردار مضبوط ہو۔ اس دنیا میں طاقت ہی کی پوجا ہوتی ہے‘ اور جب تم مضبوط بن جاؤ گے تو یہی مسلمان خود بخود تمہارے قدموں پر اپنا سر جھکا دیں گے اور اس صورت میں ہم ان کے سامنے اپنی شرائط پیش کریں گے۔ ہماری شرائط کیا ہیں؟

۱) قرآن کو الہامی کتاب نہیں سمجھنا چاہیے۔ (نعوذ باللہ!)
۲) حضرت محمدﷺ کو رسولِ خدا نہ کہا جائے۔ (نعوذ باللہ!)
۳) مکہ مدینہ کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔
۴) سعدی و رومی کے بجائے بھگت کبیر اور تلسی داس کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے۔
۵) اسلامی تہواروں اور تعطیلات کے بجائے ہندو تہوار اور چھٹیاں منائی جائیں۔
۶) مسلمانوں کو اسلامی نام چھوڑ کر ان کی جگہ ہندوستانی نام رام‘ موہن‘ کرشن وغیرہ رکھنے چاہئیں۔
۷) عربی کی بجائے مسلمانوں کی تمام عبادات ہندی میں کی جائیں۔ (وکیل امرتسر‘ دسمبر ۱۹۲۸ء)

لالہ ہردیال‘ ایم اے‘ نے ایک موقع پر یہ بھی کہا: ’’سوراج پارٹی کا اُصول ہونا چاہیے کہ ہندوستانی بچے کو قومی رتن دیے جائیں‘ خواہ مسلمان ہو یا عیسائی۔ اگر کوئی فرقہ ان کو لینے سے انکار کرے اور ملک میں دورنگی پھیلائے تو اس کی قانونی طور پر مخالفت کی جائے یا اس کو عرب کے ریگستانوں میں کھجوریں کھانے کے لیے بھیج دیا جائے۔ ہمارے ہندوستان کے آم‘ کیلے اور نارنگیاں کھانے کا انھیں کوئی حق نہیں۔‘‘

غرضیکہ تاریخ کی کتابیں ایسے ’’اقوالِ زریں‘‘ سے بھری پڑی ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات جیتنے کے بعد چند صوبوں میں مسلمانوں کے خلاف جو منظم تحریک چلائی‘ بندے ماترم کو سکولوں اور سرکاری دفاتر میں قومی ترانہ قرار دیا گیا‘ ترنگا جھنڈا قومی پرچم قرار دیا

گیا‘ اور مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ان کی تفصیل ’’پیرپور رپورٹ‘‘ میں درج ہے۔

سکولوں‘ کالجوں‘ ریلوے سٹیشنوں‘ بازاروں اور پبلک مقامات پر پانی جیسے قدرتی تحفے کے استعمال میں بھی ’’ہندو پانی‘‘ اور ’’مسلم پانی‘‘ کا انتظام کیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف تعصّب و نفرت کا ایک خاص منفی اور عملی رویّہ اختیار کر رکھا تھا اور اس کا سبب مسلمانوں کا دین اسلام تھا۔ اسی کے باعث ان کا طرزِ عمل ظالمانہ اور جارحانہ تھا۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ قیامِ پاکستان ہندوؤں کے منفی طرزِ عمل کا بھی نتیجہ تھا۔

تاہم ہماری رائے میں مذکورہ بالا تیسرا نقطہ نظر ہی اصل حقیقت ہے‘ یعنی یہ کہ قیام پاکستان کا اصل محرک اسلام اور صرف اسلام تھا۔ اس موقف کی تائید وحمایت بھی مسلمانانِ ہند کی پوری ہزار سالہ تاریخ اور ان کے مذہب و تہذیب وثقافت سے ہوتی ہے۔

جناب حنیف رامے نے ایک کتابچہ ’’نظریۂ پاکستان‘‘ کے عنوان سے شائع کیا تو اس کی ابتدائی سطور میں لکھا: ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!‘‘ یہ تھا وہ نعرہ جو تحریک پاکستان کے دنوں میں ہمارے کانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے دلوں میں گونجتا تھا‘ اور یہ تھا وہ جادو جس نے ہماری سوئی ہوئی قوم میں نئی زندگی کی لہر دوڑا دی تھی اور اُسے قائداعظم کے جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا...... یہ کلمہ اپنے اندر معانی کا ایک جہان رکھتا ہے۔ جب ہم تمام خداؤں کو چھوڑ کر ایک اللہ سے اپنا ناتا جوڑتے ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں تو ہمیں سوسجدوں سے نجات مل جاتی ہے۔‘‘

ان حقائق کی روشنی میں ایسے دانشوروں کی عقل کا ماتم ہی کیا جانا چاہیے جو قیام پاکستان کے اصل محرک کے حوالے سے کنفیوژن پیدا کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ پاکستان کی ۶۶ سالہ تاریخ سے یہ بات مزید نکھر کر سامنے آ گئی ہے کہ پاکستان آج جن گھمبیر مسائل کا شکار ہے ان کا سبب اسی نظریہ یعنی اسلام سے دُوری ہے۔ انھیں یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ پاکستان میں سندھی‘ پنجابی‘ پٹھان‘ بلوچی‘ اور مہاجر کو اکٹھا کرنے والی شے صرف اور صرف اسلام ہے۔ اگر اسلام کو درمیان سے نکال دیا جائے تو پاکستان میں ایک قومیت کی بنیاد نہ زبان بنتی ہے نہ رنگ ونسل نہ کوئی اور شے —— اس اعتبار سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام سے دُوری پاکستان کے وجود کو نہ صرف کمزور کرنے بلکہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔

ڈھٹائی پر کمربستہ جو لوگ تحریکِ پاکستان کا اصل محرک ہندو کے معاشی تسلط کا خوف قرار دیتے ہیں ان سے ایک انتہائی سادہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے کہ جس قوم کو ہندو کے معاشی تسلط کا خوف تھا اس کا اپنا مذہب کیا تھا؟ ظاہر ہے اسلام‘ تو پھر بھی وجہ تقسیم اور علیحدگی کی بنیاد تو مذہب ہی بنا تھا! حقیقت یہ ہے کہ معاشی تسلط کو اصل محرک کہہ کر وہ لفظ مذہب کے استعمال سے بچنا چاہتے ہیں۔

آخر میں دو وضاحتیں بہت ضروری ہیں۔ پہلی یہ کہ جو لوگ پاکستان کے ساتھ اسرائیل کو بھی ایک نظریاتی ریاست قرار دیتے ہیں وہ بہت بڑا گھپلا کرتے ہیں اور حقائق کا منہ چڑاتے ہیں۔ اسرائیل کی بنیاد نظریاتی نہیں نسلی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام کا بدترین دشمن بھی اگر تائب ہو کر اسلام قبول کر لے تو وہ دوسرے تمام مسلمانوں جیسا ہے اور ان جیسے حقوق رکھے گا' جبکہ کوئی غیر یہودی شخص پہلا مذہب تبدیل کر کے یہودی نہیں بن سکتا۔ یہاں تک کہ مشکوک نسل رکھنے والے پرانے یہودیوں کو بھی نسلی یہودی تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا اسرائیل کی بنیاد ان نسلی یہودیوں نے ہی رکھی تھی اور وہی اس کے کرتا دھرتا ہیں۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانا مقصود نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی ایک سیکولر ریاست وجود میں لانا مطلوب تھی تو ان کی خدمت میں دو گزارشات ہیں۔ ایک یہ کہ کیا بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے زندگی میں کبھی کسی تقریر یا تحریر میں سیکولر کا لفظ استعمال کیا؟ دوسری یہ کہ ہر کلمہ گو کو تو بلاشبہ مسلمان تسلیم کر لینا چاہیے' لیکن سیکولر کہلانے کا criteria کیا ہے؟ اس لیے کہ سیکولرزم کی اصطلاح کے بانی ہولی ہوک نے ۱۸۹۶ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ کوئی شخص اس وقت تک سچا سیکولر کہلا ہی نہیں سکتا جب تک وہ خدا کے وجود سے انکار نہ کر دے۔ پھر یہ کہ اس کے نزدیک تمام مذاہب ایک جیسے غلط ہوں گے (معاذ اللہ!) خدا کو ماننے والا سیکولر 'منافق سیکولر' ہو گا۔ ہمارے ہاں اس فکر سے تعلق رکھنے والے ایسی کوئی وضاحت نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں؟ اور بات گول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ان کے اکثر اقوال اور تحریریں تمام مذاہب کے نہیں بلکہ صرف اینٹی اسلامک ہوتی ہیں' جو سیکولرازم کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نظریۂ پاکستان اسلام کو تسلیم نہ کرنے والے پہلے اپنے بارے میں کھل کر وضاحت تو کریں۔

۲۷ستمبر ۱۹۷۱ء کو نظریۂ پاکستان کے حوالہ سے ہونے والی کانفرنس میں پنجاب یونیورسٹی کے اس دور کے مشہور و معروف وائس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم و مغفور کا یہ قول قولِ فیصل تھا کہ ''اسلام پاکستان کا دوسرا نام ہے''۔ اسلام ہی نظریہ پاکستان ہے' یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ البتہ اس حقیقت کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش کرنے والے یہ تو بتائیں کہ وہ خود کہاں کھڑے ہیں؟

تنظیم اسلامی اور ملکی انتخابات

بانی تنظیم اسلامیؒ کی یہ سوچی سمجھی رائے تھی کہ پاکستان میں غلبۂ دینِ حق اور نفاذ شریعت کی منزل انتخابی سیاست کی راہ سے سر نہیں کی جا سکتی۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں جن کا تذکرہ ان کی تحریروں اور تقریروں میں وضاحت سے ملتا ہے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم گزشتہ 65 سالہ ملکی تاریخ اور بالخصوص ایم ایم اے (متحدہ مجلس عمل) کے نام سے بننے والے اتحاد کا تجربہ ان کی دیرینہ رائے کی صداقت اور اصابت کا ناقابل تردید ثبوت ہیں — تاہم تنظیم اسلامی نہ تو اس راہ سے نفاذ شریعت کی جدوجہد کو ناجائز اور حرام قرار دیتی ہے اور نہ ہی ان دینی قائدین کی نیت پر کسی شک کا اظہار کرتی ہے جو اس راہ میں انفاقِ جان و مال کرتے ہیں — ووٹ ڈالنے کے حوالے سے تنظیم اسلامی کی پالیسی کا ذکر دستور تنظیم اسلامی کی دفعہ نمبر 11 میں ملتا ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

دفعہ ۱۱: (دستور تنظیم اسلامی)

ا) تنظیم اسلامی نہ بحیثیت جماعت ملکی انتخابات میں حصہ لے گی، نہ ہی اپنے کسی رفیق/ رفیقہ کو اجازت دے گی کہ وہ کسی انتخاب میں خود بحیثیت امیدوار کھڑا/ کھڑی ہو یا کسی دوسرے امیدوار یا جماعت یا محاذ کے حق میں کنویسنگ کرے۔ اس معاملے میں خلاف ورزی اخراج عن التنظیم پر بھی منتج ہو سکے گی۔

ب) البتہ رفقاء/ رفیقات تنظیم اپنا حق رائے دہی، جو اصلاً قومی امانت ہے، ادا کرنے کے لئے کسی امیدوار کو ووٹ دے سکیں گے/ گی۔ بشرطیکہ وہ امیدوار:

(i) کم از کم ظاہری اعتبار سے فسق و فجور کا مرتکب نہ ہو۔ اور

(ii) کسی ایسی جماعت سے وابستہ نہ ہو جس کے منشور یا اس کی اعلیٰ قیادت کے اعلانیہ نظریات و تصورات میں کوئی بات خلاف شریعت موجود ہو۔ تاہم نظم کے اعتبار سے اس ضمن میں متعلقہ رفیق/ رفیقہ کی ذاتی رائے اور صوابدید ہی حتمی ہو گی۔

ج) اس دفعہ کا اطلاق مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ کے علاوہ بلدیاتی اداروں پر بھی ہو گا البتہ سماجی تنظیموں اور اداروں، یا پیشہ ورانہ اور محکمانہ یونینوں (Trade Unions) کے ضمن میں خاص حالات میں نرمی برتی جا سکتی ہے۔ تاہم ان کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے بھی تنظیم کی اجازت ضروری ہو گی۔

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع!

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (III,II,I)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصّوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) F À قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501

Email: distancelearning@tanzeem.org

ان شاء اللہ

2013ء	تین کورس	مئی جون جولائی

پہلا کورس

13 مئی تا 31 مئی 2013ء

جس میں ترجیحاً انٹرمیڈیٹ تعلیم کے حامل طلباء، کاروباری و ملازمت پیشہ اور بے روزگار حضرات شریک ہو سکتے ہیں تاکہ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ دیگر دینی علوم سیکھ کر عملی زندگی میں باعمل مسلمان کی زندگی بسر کر سکیں۔

◐ قیام و طعام اکیڈمی کے ذمہ ہوگا۔ ◐ تعلیمی ٹائم ٹیبل اور قواعد و ضوابط کی پابندی ضروری ہوگی ◐ خوبصورت لیکچر ہال، مسجد، لائبریری اور دیگر ضروریات ایک ہی چھت کے نیچے۔ ◐ پرسکون اور پاکیزہ ماحول۔

اپنی فرصت کے مطابق نام رجسٹرڈ کرائیں

اہل ثروت حضرات سے عطیات کا خیر مقدم کیا جاتا ہے

قرآن اکیڈمی

لالہ زار کالونی نمبر 2 ٹوبہ روڈ جھنگ صدر

047-7630861- 63

0336-6778561

Email Address: hikmatbaalgha@yahoo.com